اطمینان قلب
مکتبہ اردو ڈائجسٹ
MAKTABA URDU DIGEST
مشتاق احمد اصلاحی

زندگی بھر خوش و خرم رہنے کا راز

اطمینانِ قلب

از

حکیم مشتاق احمد اصلاحی

ایڈیٹر: اخبار "رفاقت" سرگودھا

مکتبہ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

اطمینانِ قلب اور ذکرِ الٰہی کا چولی دامن کا ساتھ ہے
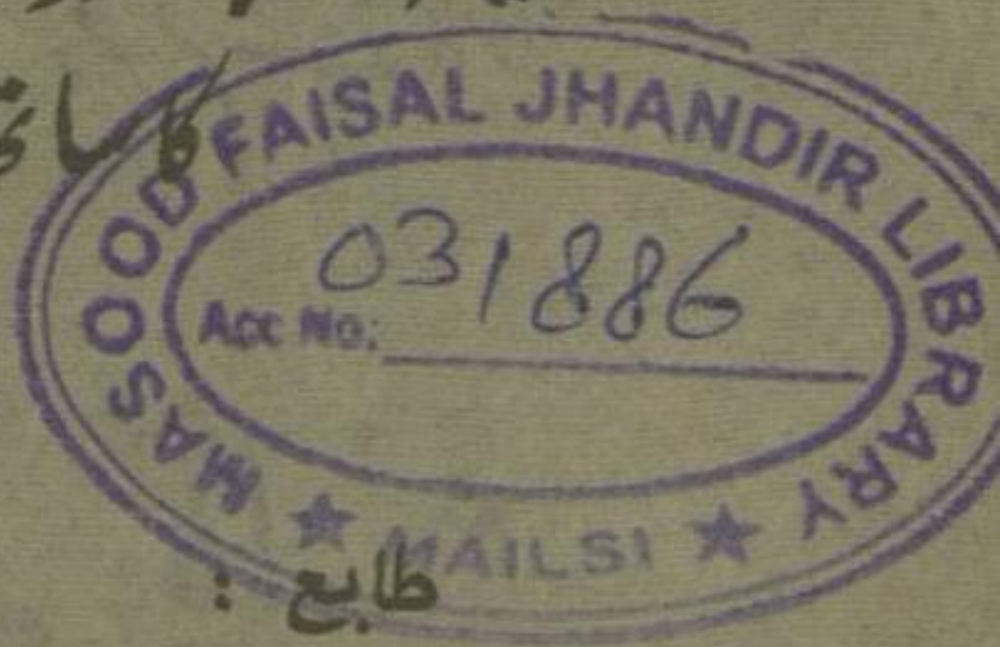
طابع : ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
ناشر : فاروق اعجاز
پرنٹر : جسارت پرنٹرز۔ لاہور
کتابت : تمکین شیرازی
اشاعت : دوم
قیمت : ۲۵۰ روپے

ترتیب و تدوین

ارشاد احمد اصلاحی، بی۔اے
اصلاحی منزل، کچہری بازار، سرگودھا
سابق اسسٹنٹ سکیورٹی آفیسر اے ایس ایف
اسلام آباد، انٹرنیشنل ایئرپورٹ،

یہ کتاب!

اطمینانِ قلب

آپ کو.....

◉ اپنی زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے، آپ کی زندگی کے روزمرہ مسائل سے بحث کرتی ہے، آپ پر آپ کی شخصیت کی عظمت واضح کر کے اس کو کامیاب و کامران بنانے کا راستہ بتلاتی ہے، آپ کو اپنی زندگی میں آئے دن پیش آنے والی الجھنوں اور پریشانیوں کو دُور کرنے کا طریقہ بتلاتی ہے، آپ کی خودی کو بیدار کر کے، آپ کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر، آسمان کی بلندیوں پر پہنچاتی ہے آپ کو آپ کی زندگی کے صحیح نصب العین سے روشناس کراتی ہے۔

وہ فطری سوالات جن کا ہر مرد و عورت کو اپنی زندگی میں سابقہ پیش آتا ہے اُن کے صحیح جوابات پیش کر کے آپ کے سامنے زندگی کا ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرتی ہے، جس سے آپ کو حقیقی اطمینان اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔

◉ آپ اپنی زندگی کو کامیاب، بامراد اور انمٹ بنا سکتے ہیں۔

◉ آپ اپنے اندر پُرمسرت زندگی کی رکاوٹوں کو دُور کرنے کی صلاحیت پیدا

کر سکتے ہیں۔

آپ جوں جوں اس کتاب کو پڑھیں گے، آپ پر اپنی زندگی کے ٹھوس حقائق واضح ہوتے جائیں گے۔

اور جب آپ

اپنی موجودہ غیر مطمئن اور اطمینانِ قلب سے محروم زندگی کو بدل ڈالنے کا عزم کر لیں گے، تو یہ کتاب آپ کے سامنے زندگی کے نئے انداز اور نئے راستے کھول دے گی۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
(علامہ اقبالؒ)

اِنتساب

میں اپنی یہ کتاب، اس کتاب کے قارئین کے نام منسوب کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں کہ ــــ شائد وہ اس کے مطالعہ سے اپنی زندگی کو اطمینان اور حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کر سکیں۔

اِصلاحی

پڑھنے والے کے نام

پیارے دوست۔ السلام علیکم

میں اس کتاب میں آپ کی دلچسپی کی قدر کرتا ہوں۔ میں نے یہ کتاب آپ کو اپنے ذہن میں رکھ کر لکھی ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ آپ اپنی زندگی کے ٹھوس حقائق پر سنجیدگی سے غور کئے بغیر دوسرے لوگوں کے ساتھ دیکھا دیکھی غلط اور ادھورے مقاصد کی دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں جو آپ کو اطمینان بخش اور پُرسکون زندگی سے کوسوں دُور لئے جا رہے ہیں، آپ اپنے پاس ڈھیروں دولت، آرائشی بنگلے، کاریں، جوان بیٹے اور بیٹیاں، اچھا کاروبار، عہدہ، اعلیٰ تعلیم اور سٹیٹس رکھنے کے باوجود اطمینانِ قلب سے محروم ہیں۔ مجھے خوشی ہو گی اور میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے، بلکہ اس سے بھی ضروری بات کہ اس کی تجاویز کے مطابق عمل کرنے سے آپ کو کامیاب زندگی کا صحیح شعور حاصل ہو۔ آپ میں خود اعتمادی کا جذبہ اور زندگی میں حقیقی دلچسپی پیدا ہو، تاکہ آپ حقیقی پُرمسرت زندگی کا لطف حاصل کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مطلوبہ نتیجہ آپ کچھ پاکیزہ نظریات اور اصولوں کو اپنانے سے ہی حاصل کر سکیں گے۔ جو اگرچہ سادہ اور آسان ہیں مگر گردوپیش کے ناسازگار ماحول اور فضا نے انہیں اتنا آسان نہیں رہنے دیا ہے۔

آپ کو اپنی کچھ نہ کچھ خواہشات، دلچسپیوں اور جذبات کو ان زندگی بخش اصولوں کی خاطر قربان بھی کرنا ہوگا، پھر ہی آپ کے لئے پُرمسرت زندگی کی منزل آسان ہو سکے گی۔

آپ ایک اور بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہماری پُرمسرت زندگی ہمارے خدا کے ہاں بھی پسندیدہ ہے، میں یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا خدا ہماری زندگی کو پُرعزم توانا اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔ ہمارا خُدا اس وسیع اور نعمتوں سے بھرپور کائنات میں ہمارے جسم، ہمارے ذہن اور ہماری روح کو فعّال دیکھنا چاہتا ہے۔ ہمیں ان تینوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

خدائے برتر و بزرگ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

آپ کا مخلص

حکیم مشتاق احمد اصلاحی

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام عنوان	صفحہ

صفحہ	نام عنوان	نمبر شمار
۱۹۹	اصلاح نفس میں نماز کا حصہ	۶۲
۲۰۰	معرفت نفس	۶۳
۲۰۰	فرض شناسی اور اطاعت	۶۴
۲۰۱	ڈسپلن اور ضبط نفس	۶۵
۲۰۳	روحانیت کی پرورش میں نماز کا حصہ	۶۶
۲۰۴	روزہ	۶۷
۲۰۷	ہمارے نفس کے تقاضے اسلام کس خوبی سے پورا کرتا ہے	۶۸
۲۲۱	شہوات	۶۹
۲۳۱	تعلقات	۷۰
۲۳۹	روحانیت یا روحِ ملکوتی	۷۱
۲۴۱	روحانیت کا حقیقی مفہوم	۷۲
۲۴۴	تصوّف	۷۳
۲۴۸	حضرت علی ہجویری عرف داتا گنج بخش کے اصلاحی کارنامے	۷۴
۲۴۹	شریعت و طریقت میں توازن	۷۵
۲۵۲	حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تصوّف	۷۶
۲۵۳	دنیا کی حقیقت	۷۷
۲۵۵	روحانیت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ	۷۸

پیش لفظ

۱

ابتدائے آفرینش سے آج تک انسان کی سب سے بنیادی ضرورت دل کا چین اور قلب کا اطمینان ہی رہا ہے۔ بلاشبہ انسان کو جسم و جان کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے غذا کی اور نسلِ انسانی کو جاری رکھنے کے لئے رشتۂ ازدواج کی ضرورت ہے لیکن ان کی حیثیت مقصد کی نہیں، ذریعہ کی ہے۔ یہ ضروری ہیں لیکن اس لئے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کر سکے اور بالآخر اسے انفرادی اور تہذیبی دونوں سطح پر سکون، چین اور اطمینان حاصل ہو سکے، غذا اور جنس دونوں کی حیثیت ٹیکنالوجی کی سی ہے جس کا ہدف ان بالاتر مقاصد کا حصول ہے جو انسانی وجود کو معنی بخشتے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے دو مختلف تصور تقریباً ہر دور تہذیب اور ہر زمانے میں برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ایک وہ جس نے ان ذرائع کے حصول کو اصل مقصد قرار دے دیا اور پھر انسان کو اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کی جد و جہد سے بے نیاز کر کے انہیں کھلونوں میں الجھایا۔ اِس

کے نتیجہ میں مادی ترقی ضرور رونما ہوئی لیکن نہ فرد روحانی اور اخلاقی بالیدگی حاصل کر سکا اور نہ سماج خیر و انصاف کا گہوارہ بن سکا۔ ہر دور کی جاہلیت کا یہی موقف رہا ہے اور آج بھی مغربی تہذیب کا نقطہ نظر یہی ہے اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

دورِ جدید کے ایک نامور فلسفی نے اس صورت حال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہ سیکھ سکے۔"

اور علامہ اقبال نے اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دراصل زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کے لئے انسان کو ایک دوسرے نظریہ کی ضرورت ہے جس کے تحت انسان کا اصل مقصد زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی بندگی اور اس کی رضا کا حصول ہو اور پھر وہ زمین پر خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے نیکیوں کا قائم کرنے والا اور برائیوں کے خلاف جہاد کرنے والا بنے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے تحت انسانی جسم و جان اور مادہ اور روح میں حقیقی توازن پیدا ہوتا ہے اور کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت میں اور

انسان خیر و صلاح اور عدل و انصاف کی خدمت میں مصروف ہوتے ہیں۔ زندگی کا یہ نظریہ جسم کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور قلب کو بھی اطمینان کی دولت سے نوازتا ہے اور یہ مطمئن انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے خدا کی زمین پر انصاف کو قائم کر کے کائنات کو بھی نیکیوں اور خوشیوں اور شادکامیوں سے بھر دیتا ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو ہر دور میں انبیاء علیہم السلام نے انسانیت کو دکھائی ہے اور جس کی طرف اللہ کے آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف انسانوں کو بلایا بلکہ اس کے مطابق ایک معاشرہ قائم بھی کر دیا۔

آج کے انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ وہ اس راستہ کو اختیار کر سکے جو اطمینانِ قلب کی طرف لے جانے والا ہے اور جس سے انسان خیر کا علمبردار بن جاتا ہے۔ جناب حکیم مشتاق احمد اصلاحی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس تمام لوازمہ کو اس کتاب میں جمع کر دیا جو اسلام کی اس شاہراہ کو واضح کرتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان بڑا صاف اور سادہ ہے اور اس کتاب کی سطر سطر سے ان کا خلوص ٹپکا پڑتا ہے۔ انہوں نے ایک "حکیم" کی نگاہ سے انسان کے حالِ زار کا مطالعہ کیا ہے اور ایک "مصلح" کی شان کے ساتھ اس کے امراض کا علاج تجویز کیا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی پیش نہیں کی جس کی سند اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں نہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو صلحائے امت کے اقوال اور ان کی پاکیزہ مثالوں سے بھی آراستہ کیا ہے

اور جہاں ضرورت محسوس کی مغرب کے اہلِ علم کی شہادت بھی پیش کی ہے، ان کی یہ کوشش نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب علمی کاوش ہے بلکہ مجھے توقع ہے کہ یہ ظلم اور فساد کے ستم زدہ انسان کو روشنی اور نور کی طرف لانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

میری دعا ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے نافع ہو اور خود محترم حکیم صاحب کے لئے بھی ذریعۂ نجات بنے۔

خورشید احمد

پروفیسر خورشید احمد
چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
۳، سٹریٹ ۶۲، شالیمار ۶/۴
اسلام آباد
سابق وفاقی وزیر و ڈپٹی چیئرمین پلاننگ
حکومت پاکستان۔ اسلام آباد

۲۹ مارچ ۱۹۸۱ء

۲

ظاہر ہے کہ اس دَور میں لوگوں کو اطمینانِ قلب کی زبردست تلاش ہے، سب کچھ ہے بس یہی شے مفقود ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے وہی موضوع منتخب کیا ہے جو آج کل کے مشینی دَور کی حقیقی اور فطری ضرورت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی اس موضوع کو اس خوبصورتی سے بیان کر سکتے تھے۔

میں نے اس کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اسے دَورِ حاضر کے پریشان حال انسان کے لئے بہت مفید محسوس کیا ہے میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم صاحب کی اس محنت کو خلقِ خدا کے لئے مفید بنائے اور اس کی مدد سے خلقِ خدا کو راہِ ثواب پا لینے کی توفیق عطا فرمائے۔

محترم حکیم مشتاق احمد اصلاحی صاحب میرے برس ہا برس کے رفیق اور دوست ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ "اطمینانِ قلب" سے سرشار پایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع انہی کو زیب دیتا تھا، جو اِن کے لئے وارداتِ قلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میرے ساتھ نَو دس ماہ تک ایو بی قید خانہ میں رہے

انہیں میں نے شدید مالی مشکلات سے دوچار بھی دیکھا، ان کے گھر میں بیماریوں نے برسوں ڈیرہ ڈالے رکھا، ان کو مختلف مادی اور روحانی صدمات سے دو چار ہونا پڑا، لیکن ان کے دل و دماغ کا جہاز "سکونِ قلب" کے ساحل پر ہمیشہ لنگر انداز پایا گیا۔ ان میں کوئی بناوٹ اور دکھاوا نہیں ۔ وہ ایک سیدھے سادے مومن انسان ہیں، اور زندگی کو سکونِ قلب سے معمور رکھنے کا فن جانتے ہیں، وہ ہر حالت میں پُر سکون رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ان کی اس صفت ایمان کو اپنے قارئین میں منتقل کر سکے گی اور حکیم صاحب اپنی حاصل کردہ اس نعمت ایمان کا وافر حصہ اپنے قارئین کو دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یورپ کے کاروباری بناوٹی اخلاق، کے مقابلے میں حکیم صاحب کا "یہ نسخہ اطمینان" حاصل کر کے بہتوں کا بھلا ہو گا، اس "اطمینانِ قلب" کا منبع "تعلق باللہ اور توکّل علی اللہ ہے، اور یہی اطمینان کا حقیقی سرچشمہ ہے

سید اسعد گیلانی

السید اسعد گیلانی ایم۔ اے
ڈائریکٹر اسلامی اکیڈمی
المنصورہ مرکز
لاہور

۳

اطمینانِ قلب ایک ایسا مضمون ہے کہ جس پر کتابیں لکھے جانے کی اس وقت ضرورت ہے۔ مادہ پرستی نے مسلمان کے قلب کو بھی متاثر کر دیا حالانکہ مسلمان کے قلب میں اطمینان سب سے زیادہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان تو مسلسل اللہ تبارک و تعالےٰ کا ذکر کرتا ہے اور جہاں تک موجودہ تہذیب کے پیرو ممالک کا تعلق ہے تو وہاں تو اطمینانِ قلب کے فقدان نے ایک مستقل اور خطرناک بیماری کی صورت اختیار کر لی ہے جس کے علاج میں وہ ممالک مصروف ہیں۔

اس کتاب میں "اطمینانِ قلب" کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے وہ سوالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جو عام انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مغرب میں "اطمینانِ قلب" کے فقدان نے کیا کیفیت پیدا کر دی ہے اور کس طرح اس بیماری کے علاج میں سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ بھی بتایا گیا ہے۔ پھر آخر میں وضاحت کی گئی ہے کہ "اسلام" کس طرح عدم

اطمینان کا علاج کرتا ہے۔

فاضل مصنّف نے کوشش کی کہ انسان کی خودی کو بیدار کرے۔ زندگی میں اس کے لئے گہری دلچسپی پیدا کرے تاکہ وہ اپنا نصب العین معیّن کرے، منصوبہ بنائے اور اپنی فلاح کے لیے جدّوجہد کرے۔

انسان کو بتایا ہے کہ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کوشش سے ایک کامیاب بامراد، پاکیزہ، اطمینان و مسرّت سے پُر زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان کو صبر سے کام لینا چاہیئے، مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیئے، باعزم ہونا چاہیئے، اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا اور اس کی رضا پر راضی رہنا چاہیئے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اطمینانِ قلب کے حصول کے لئے اس کتاب میں بہت سی راہنمائی ہے۔

بدیع الزماں کیکاؤس

بدیع الزمان کیکاؤس
(ریٹائرڈ) جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان

دیباچہ

یہ ماہ نومبر کی ایک سرد شام تھی کہ میں محکمہ حفظانِ صحت پنجاب کی ملازمت کے دوران ایک پہاڑی مقام پر بیماری کی وبا پھوٹ پڑنے کی وجہ سے دورہ پر تھا۔ ہم مختلف محکموں کے ملازمین ہر شام اکٹھے چائے پیا کرتے تھے، اس شام بھی ہم حسبِ معمول محکمہ زراعت کے ایک دوست کے ہاں چائے پی رہے تھے، ہر دوست اپنے محکمہ کے کسی ہیڈ کلرک یا آفیسر کا ذکر چھیڑ لیتا تھا یا پھر تنخواہوں اور انکریمنٹوں کی بات شروع ہوتی تھی، گھریلو پریشانیوں کے تذکرے ہوتے تھے۔ وقت گذارنے کے لئے کبھی کیرم بورڈ سے دل بہلا لیتے تھے یا باہر سیر کو نکل جاتے تھے، ایک دوست کو افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا وہ فرضی قصے اور کہانیاں بیان کرنے لگتا، اذان ہوتی تو میں سب دوستوں کو نماز کے لئے مسجد کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا، ہمیں گذارہ کے لئے اچھی تنخواہ مل جاتی تھی، اس لئے ہم اور ہمارے گھر والے قدرے مطمئن تھے۔ مگر ہماری گفتگو کا محور عام طور پر اپنے دفتری حالات ہی رہتے اور دفتری اوقات کی ڈیوٹی کے بعد کا وقت ہم اس طرح گذار دیتے جیسے ہماری زندگی کا اور کوئی مقصد نہ ہو یا یہ ہمارے نظامِ تعلیم کی خامی تھی یا بہ حیثیتِ مجموعی ہماری قوم کی غفلت تھی کہ ہم اپنی زندگیوں کے کسی اعلیٰ مقصد سے روشناس ہی نہ تھے اور زندگی کے اوقات کو بے مقصد گزار دینے کو ہی اپنا مقصد بنائے ہوئے تھے، اس یادگار

شام ہمارے ایک دوست غازی سلطان محمود مکان میں داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا۔ اُن کے چہرے پر ایک خاص قسم کی طمانیت تھی، انہوں نے داخل ہوتے ہی وارفتگی کے عالم میں ہمارے سامنے ایک پمفلٹ کے کچھ اقتباسات پڑھنے شروع کردیئے، اُن کے اس ذوق وشوق کو دیکھ کر ہم نے بھی پوری توجّہ سے پمفلٹ کی عبارتیں سُننا شروع کردیں، جلدی ہی ہم نے محسوس کیا کہ اس پمفلٹ نے تو ہمارے دل ودماغ کے دریچے کھول دیئے، ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں کوئی گم گشتہ چیز مل گئی ہے، اس پمفلٹ نے ہمیں توحید کی حقیقت سے آشنا کرکے ہماری خودی کو بیدار کردیا، ہمیں خود اعتمادی کا ایک اتھاہ خزانہ مل گیا اور ہمارے سامنے فکر وعمل کی نئی راہیں کھل گئیں۔ ہمیں اپنی زندگیوں کی حقیقی منزل دکھائی دینے لگی، ہماری سوچ کے زاویے بدل گئے۔ ہماری زندگیوں کو ایک نصب العین مل گیا، ہمارے دل ونگاہ کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا، ہمارا تعلق ایک ایسے شہنشاہ اور احکم الحاکمین سے جوڑ دیا۔ جس کی مٹھی میں بڑے بڑے جبارین، متکبّرین، بادشاہوں، فرعونوں اور نمرودوں کی پیشانیوں کے بال نظر آنے لگے، ہمارا تعلق خدا کے باغی انسانوں سے کٹ کر خدا کے اپنے کلام اور اس کے برگزیدہ پیغمبروں سے جڑ گیا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ ہمارے اس کلمۂ توحید:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کی تشریح تھی، جسے ہم دن رات پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں مگر ہم نے اس کے معنوں پر اتنی گہرائی سے کبھی غور نہ کیا تھا، عربی کا ایک برکت والا کلمہ سمجھ کر پڑھ لیا کرتے تھے، اس میں چھپی ہوئی بلندیوں سے ہماری نگاہیں ناآشنا تھیں۔ اس پمفلٹ میں کلمہ کے معنی یہ لکھے تھے:

"صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ یعنی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔"

یہ معنی تو ہم نے پہلے بھی پڑھ رکھے تھے اور سنتے بھی رہتے تھے مگر اس کی اصل تشریح سے ناواقف تھے۔

کلمہ پاک کی تشریح:

اس عقیدہ کے پہلے جزو یعنی اللہ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ:۔

زمین و آسمان اور جو کچھ بھی زمین و آسمان میں ہے، سب کا خالق، پروردگار مالک اور طبعی و قانونی بادشاہ یعنی حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس بات کو جاننے اور ماننے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو اپنا ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس اس قسم کی کوئی طاقت اور اقتدار ہی نہیں ہے۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقوے اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا اللہ ہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی سے پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو خدائی اختیارات میں ایسا دخیل اور زور آور نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیوں کہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے۔ کسی کو با اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے، جو ایک اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں کیوں کہ اپنے ملک اور مخلوق کا ایک ہی جائز حاکم صرف اللہ ہے۔

پھر اس عقیدے کے دوسرے جزو یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا — وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس بات کو جاننے اور ماننے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون وچرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لئے صرف اتنا کافی ہو، کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا سے ثابت ہے۔

۳۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی، راہنمائی تسلیم نہ کرے دوسرے

انسانوں کی پیروی، کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ کتاب و سنت کے مطابق ہو، اُسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اُسے ترک کر دے اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لئے اُسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے، خواہ وہ شخصی ہوں، یا خاندانی یا قبائلی و نسلی و قومی و وطنی یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس کی مدِ مقابل بن جائے۔

۶۔ رسولؐ خدا کے سوا کسی کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے یا کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اُسی درجہ میں رکھے۔

۷۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے، کہ اس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہو۔

ہمارے دوست سلطان محمود صاحب نے تو یہ عبارتیں بے ساختہ انداز میں پڑھ ڈالیں مگر ہمارے دلوں میں تو یہ بجلی کی ایک لہر دوڑا گئی اور ہمارے سینے نورِ ایمان سے معمور ہو گئے۔ ہم نے چائے کی پیالیاں میز پر رکھ دیں اور سوچنے

لگے کہ ہماری مسجدوں میں تو واعظین اور تبلیغ کرنے والوں نے اس وضاحت
کے ساتھ کبھی کلمۂ توحید سمجھانے کی کوشش ہی نہ کی، وہ تو اپنا زورِ بیان اختلافی
مسائل اور منطقی موشگافیوں پر ہی صرف کرتے نظر آئے اور نئی نئی فرقہ بندیاں
پیدا کر کے مسلمانوں کے دلوں میں باہمی محبت کی بجائے نفرت کے بیج ہی بوتے
رہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے نوجوان اور بوڑھے ہماری مائیں اور بہنیں توحید
کی حقیقت سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے توہمات کا شکار ہو گئیں۔ ہم نے
اس پمفلٹ کو ان سے لے کر بار بار پڑھا اور اپنے بنیادی کلمہ کے مفہوم کو ذہن
نشین کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں اس کے ذریعہ "رضائے الٰہی حاصل کرنے"
کا ایک پیارا نصب العین مل گیا۔ ہم نے ناولوں، افسانوں، جاسوسی رسالوں
اور فحش کتابوں کا مطالعہ بند کر دیا۔ خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکامات کی تلاش
میں ہمارا تعلق کتاب اللہ اور اسلامی لٹریچر سے جڑ گیا۔ اس لٹریچر نے
مختلف مسائل اور معاملات کے متعلق ہماری ذہنی الجھنوں کو دور کر دیا، مغربی
تہذیب کی ترقی اور آرٹ و کلچر کے خوشنما ناموں کی مرعوبیت ہمارے ذہنوں
سے دور ہو گئی۔ ہم مثبت طور پر اسلام کو غالب کرنے کے علمبردار بن گئے۔ ہمارے
دلوں میں اسلامی قوانین اور نظام مصطفےٰ کے نفاذ کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات
مچلنے لگے۔

ماہ نومبر کی یہ سرد شام ہمارے لئے ایک رحمت بن گئی۔ اس شام کو بیتے کئی برس
ہو چکے ہیں، مگر یہ شام ہمیں نہ بھولی ہے، نہ بھولے گی، کہ اس شام نے ہماری زندگی کی
گاڑی کو صحیح پٹڑی پر رکھ دیا تھا۔ رزق حلال کی تلاش میں ہم معاشی مشکلات سے بھی
دوچار رہے، ہمیں گھروں میں اموات کے صدمے بھی سہنے پڑے، ملکی معاملات کے

متعلق حکمرانوں کو صحیح مشوروں کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں ہم نے اقتدار کے ماتھے پر بڑی بڑی شکنیں بھی دیکھیں، مگر ہم اطمینان کے ساتھ اپنے راستہ پر گامزن رہے، کیوں کہ ہمیں اپنی زندگیوں کا صحیح نصب العین مل گیا تھا۔ ہمیں کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے مطالعہ نے راہِ ہدایت اور راہِ ثواب دکھا دیا تھا۔ زندگی کے حقائق کی آگاہی سے ہمیں خوف و حزن سے نجات مل گئی، ہمارے تفکرات اور پریشانیاں دُور ہو گئیں اور ہم برسوں سے نہایت اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنا سفرِ زندگی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اطمینانِ قلب کی اس دولت سے اپنے بھائیوں، دوستوں، نوجوانوں، بہنوں بیٹیوں بلکہ تمام لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جائے تاکہ اطمینان کے متلاشی لوگ اس کتاب سے استفادہ کر سکیں، اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنی ایک مشکل کام تھا، مگر جب میں نے اس کو لکھنا شروع کر دیا تو اللہ تعالےٰ نے اس کی توفیق عطا فرما دی

میں اپنے قارئین کی آراء اور مفید مشوروں کا منتظر رہوں گا۔ امید ہے کہ وہ مجھے اپنی آراء سے ضرور آگاہ کرتے رہیں گے اور اگر اُن کے ذہن میں مزید کوئی سوال یا اُلجھن پیدا ہو تو میں اُن کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہوں گا۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

آپ کا مخلص

خاکسار حکیم مشتاق احمد اصلاحی

ایڈیٹر "رفاقت" سرگودھا (پاکستان)

اطمینانِ قلب کی تلاش

انسان اگر اپنے گرد و پیش پائی جانے والی مخلوق پر غور کرے تو اُسے محسوس ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو "اشرف المخلوقات" بنا کر اس کائنات میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات کی نسبت اسے کہیں بہتر صلاحیتیں عطا کی ہیں، جمادات بے حس و حرکت اور بے جان مخلوق ہے، نباتات کو زندگی کے کچھ آثار دئیے ہیں اور حیوانات کو زندگی اور محدود عقل دے کر انسان کا خادم بنا دیا ہے مگر انسانی کو حیوانی خصوصیات کے علاوہ قوّتِ گویائی یعنی مافی الضمیر ادا کرنے کی طاقت عطا فرمائی، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں دیں، کائنات کی اشیاء میں تصرّف کر کے انہیں مفید مطلب بنانے کے لئے اسے بہترین دماغ دیا، اس کو ایسا دل دے دیا جو گوناں گوں جذبات محبت. نفرت، دوستی، دشمنی، خوف، طمع، لالچ اور دوسری ضروری فطری خواہشات سے لبریز ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی روح پھونک دی جس سے اس کے نفس اور ذہن کو نیکی اور بدی، غلط اور صحیح، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ کے درمیان تمیز کی خوبیاں میّسر آگئیں اور انسان اس کائنات میں اللہ تعالےٰ کی تخلیق کا ایک شاہکار قرار پا گیا۔

انہی گوناگوں خوبیوں اور روحانی صلاحیتوں نے انسان کے اندر "اطمینانِ قلب" کی تلاش کا شعور اور احساس پیدا کیا، جس کے حصول کے لئے ہر انسان اپنی اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق سرگرداں رہتا ہے۔

اطمینانِ قلب کی اہمیت

"اطمینانِ قلب" کے حصول میں انسان کی یہ سرگردانی بلا وجہ نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "اطمینانِ قلب" اور خوشی و راحت کی یہ تلاش اس کی روحانی سرشت میں رکھ دی گئی ہے اور یہ اس کے تحت الشعور میں موجود رہتی ہے۔ اور "اطمینانِ قلب" کی یہ دولت ایک ایسی نعمت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی اور نہ ہی کوئی اور چیز اس کا بدل ہو سکتی ہے، پھر یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ اسے بڑی سے بڑی دولت کے ذریعہ بھی نہیں خریدا جا سکتا، انسان بعض اوقات اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ روپیہ پیسہ عام ہو تو "اطمینانِ قلب" بھی مِل جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔

مادی لحاظ سے ہم کتنے ہی فارغ البال ہو جائیں، ضروری نہیں کہ ہمیں "اطمینانِ قلب" بھی میسر ہو، بلکہ جن کی تجوریاں سیم و زر سے بھرپور ہوتی ہیں، اُن کے سینے اکثر سکون و اطمینان سے محروم ہوتے ہیں، بہت سے ایسے دولت مند، سرمایہ دار، کارخانہ دار اور اونچے منصب رکھنے والے آپ کو ملیں گے جنہیں سارے مادی وسائل اور آسانیاں تو میسر ہیں مگر ان کی زندگی بے اطمینانی کی حالت میں اجیرن ہو رہی ہے اور لمحہ بھر کا سکون بھی انہیں حاصل نہیں ہے۔

غیر اسلامی معاشرہ بے اطمینانی کی لپیٹ میں

آج امریکہ اور برطانیہ دنیا کے متمول، ترقی یافتہ اور مشغول ترین ملک ہیں، ہر شخص کے پاس کار، کوٹھی، وافر دولت اور کھانے پینے کی تمام چیزیں میسر ہیں لیکن وہاں پر بھی عام لوگوں میں بے اطمینانی اور ذہنی پریشانی روز افزوں ہے، وہاں کے ڈاکٹر، فلاسفر، ماہرینِ نفسیات اور دانشور چیخ اٹھے ہیں اور اس کیفیت کے سدِ باب کی ان کو کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔

بے چینی کا یہ عالم ہے کہ چند سال قبل سال کی ایک ششماہی میں صرف ریاست کیلیفورنیا کے پانچ لاکھ باشندوں نے بے اطمینانی اور مایوسی کا شکار ہو کر خودکشی کی تھی، ان ممالک میں جنون اور پاگل پن جیسے امراض کی کثرت ہو رہی ہے۔ میکلیگن یونیورسٹی کے پال۔ ایچ ہارڈن اور فلوریڈا یونیورسٹی کے گیرل کے لسلی لکھتے ہیں کہ ۱۰ سال قبل امریکہ کے تمام ہسپتالوں میں جتنے بستر تھے، اُن پر تقریباً نصف تعداد دماغی مریضوں کی ہوتی تھی، مگر اب ہسپتالوں میں داخل مریضوں کی یہ تعداد اگرچہ تقریباً ۳۷ فیصد ہوتی ہے مگر (Outdoor) مریضوں کی یہ تعداد ڈیڑھ ملین سے بڑھ کر تین ملین ہو گئی ہے۔ امریکہ کے علاوہ انگلینڈ اور سوشلسٹ ممالک کا حال بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ ان ترقی یافتہ ممالک کے امیر لوگوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی وہاں کے پارکوں اور سیر گاہوں میں جمع ہو کر اطمینانِ قلب کی تلاش میں کانفرنسیں کرتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، تجویزیں پاس ہوتی ہیں، ماہرینِ نفسیات کے مشورہ لئے جاتے ہیں، جب ان نوجوانوں کو اطمینان

قلب کا کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ نشہ آور چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کے ہپی (HIPPY) نوجوانوں کے غول کے غول سڑکوں پر پھرتے نظر آتے ہیں ان میں سے کئی جوڑے مشرقی ممالک کو نکل آتے ہیں اور یہاں کی سڑکوں اور ہوٹلوں کی سیڑھیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ منشیات کو استعمال کرنے کے علاوہ مغرب میں غم غلط کرنے کے لئے ہزاروں ٹن مسکن ادویات (Tranqualizer) بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ میں صرف ایک سال میں ۲۵۰ ملین ڈالر یعنی اڑھائی ارب روپیہ کی مسکن ادویہ استعمال ہوتی ہیں، انگلینڈ میں بھی ان کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ واشنگٹن کے ایک فوٹو گرافر کی بیوی ہر ماہ ۵۰۰ ڈالر یعنی پانچ ہزار روپے مسکن ادویہ پر خرچ کرتی ہے۔ دوائیوں کی صرف ایک کمپنی کو پچھلے سال ٹیکس ادا کرنے کے بعد صرف مسکن ادویہ سے آمدنی (Net Income) تین ارب تینتالیس کروڑ روپیہ ہوئی۔

ان ممالک کے ڈاکٹروں اور فزیشنوں (Physician) کا کہنا ہے کہ ان کے پاس روزانہ کئی مریض ایسے آتے ہیں جن کو بظاہر کوئی بیماری نہیں ہوتی، مختلف (Test) کرانے کے بعد بھی ان کی کسی بیماری کا پتہ نہیں چلتا، مگر وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار ہیں۔ دراصل ان کی روح پریشان ہوتی ہے اور وہ اطمینان چاہتی ہے۔

امریکہ کے مشہور ماہر اقتصادیات و سوشیالوجی فرڈینینڈ لنڈبرگ اور مشہور ماہر نفسیات و دماغی امراض مارینا دونوں لکھتے ہیں کہ:

"جدید انسانی زندگی میں غم و الم اور پریشانیوں کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اور اتنا شدید تر بھی کہ سخت تشویش و فکر کا باعث بنا ہوا ہے، اس سبب سے ہماری سوشل، کلچرل اور ذاتی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ جدید تہذ

کو آج جو شدید بحران (Crisis) گھیرے ہوئے ہے، اس کی وجہ بھی یہی بڑھتی ہوئی الم انگیزی یا ناخوشی ہے۔ اس بحران کی علت اور اس کا جدید اثر دونوں ہی بنیادی طور پر روحانی (Psychic) ہے، یہ جدید بحران اقتصادی بھی ہے سوشل بھی اور سیاسی بھی، ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، مگر یہ بنیادی طور پر روحانی ہے۔ نیز یہ بحران عورت کے گرد گھومتا ہے۔ اگرچہ اس کو مردوں نے حرکت دی ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"مادی ترقی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ڈیڑھ سو سال قبل اس کا خیال بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ مادی لذتوں اور خوشیوں کے لئے سامان آرائش و آسائش ہمارے گرد کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود یہ دور ایسا ہے کہ جہاں تک احساسات کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ انسانی میں، سب سے بڑھ کر بے اطمینانی، غمگینی اور ناخوشی کا دور ہے، یہ غم واندوہ بڑھ رہا ہے اور حیرت انگیز طور پر پھیلتا جا رہا ہے، جسمانی بیماریاں اور وبائیں اگرچہ کم ہو گئیں ہیں، مگر اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں نے ہماری سوسائٹی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ہم میں سے ۵۰ سے ۶۰ فیصد لوگ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں سے پریشان رہتے ہیں۔

برطانیہ و امریکہ کے وہ بڑے لوگ جو عام طور پر اُن بڑی بڑی کمپنیوں اور تجارتی اداروں کے "منیجر" ہوتے ہیں، جن کے کاروبار لاکھوں اور کروڑوں ڈالر پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، ان منیجرز کی بیماری بھی ان ملکوں کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ "ٹائم میگزین" کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب اس قسم کے پچیس ہزار منیجرز (Managers) کی صحت کا معائنہ کیا گیا جن کی عمریں

اوسطاً ۵۴ سال کی تھیں تو نیو یارک کے (Life Extention) ایگزیمنرز کو معلوم ہوا کہ ان میں سے صرف ۲۵ فیصد کی صحت نارمل تھی۔ شکاگو کے تین ڈاکٹروں نے ۵۵ ایسے انتظامی عہدہ داروں کا معائنہ کیا جن کی عمریں ۵۰ سال سے کم تھیں تو معلوم ہوا کہ صرف تین جسمانی لحاظ سے تندرست تھے۔ سٹینڈرڈ آئل کمپنی کے تین صد چالیس انتظامی عہدہ داروں نے جب طبی معائنہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا تو ۲۳۵ افراد کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا پائے گئے اور ۱۹۲ افراد ایسی بیماریوں میں مبتلا تھے، جراثیم کی قوت کارکردگی کو متاثر کرنے والی تھیں۔

جرائم سے بھی کسی سوسائٹی کی خوشی و غمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو تو آپ حیران ہوں گے کہ ایک سوشلسٹ ملک فن لینڈ میں تمام دنیا سے زیادہ قتل ہوتے ہیں (World Almanac) سے آپ کو پتہ چلے گا کہ امریکہ میں ہر سال بیس ہزار (۲۰۰۰۰) سے زائد قتل ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں اکاون ہزار (۵۱۰۰۰) زنا بالجبر کے واقعات ہوئے یعنی روزانہ ایک صد چالیس خواتین کی زبردستی عصمت دری کی گئی اور اب یہ تعداد بڑھ کر دوگنی یعنی تین صد روزانہ تک پہنچ چکی ہے کیوں کہ بہت سی خواتین بدنامی وغیرہ کے خوف سے رپٹ ہی درج نہیں کراتیں، ہر سال چار لاکھ ڈاکے اور پچیس لاکھ مکانوں میں چوریاں ہوتی ہیں۔ ہر سال ذہنی پریشانیوں اور تفکرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے پچیس ہزار افراد خودکشی کرتے ہیں، تفکرات اور غموں کی وجہ سے ہر سال تقریباً گیارہ لاکھ آدمی امراضِ قلب وغیرہ کا شکار ہو کر راہئ ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں پاکستان جیسے پسماندہ اور ترقی پذیر ملک میں جس میں عام دولت کی فراوانی نہیں پاتے بمشکل ہیں۔

اہلِ مغرب کو اس گرداب میں کس نے پہنچایا؟

اہلِ مغرب کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مغربی ممالک کے لئے ہی نہیں بلکہ مشرقی دنیا کے لئے بھی ایک بد قسمت دَور کا آغاز تھا کہ جُوں جُوں سائنسی میدان میں نئے نئے اکتشافات اور ریسرچ میں ترقّی ہوتی گئی، مذہبی نظریات و عقائد کے خلاف نفرت اور عناد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور مغربی معاشرہ نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی تھی، وہ اسے ایک عرصہ تک دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف لئے جاتا رہا۔ اس کے ذمّہ دار تو دراصل وہ عیسائی پادری تھے جن کو سیاسی اقتدار حاصل تھا اور انہوں نے اپنی نادانی سے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم جاہلی یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر استوار کر رکھا تھا۔ جن کا دراصل ان کے مذہبی عقائد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ان غلط نظریات سے اس حد تک چمٹے ہوئے تھے کہ ان میں ذراسی تبدیلی کو بھی اپنے مذہب کی موت تصوّر کرنے لگے تھے، انہوں نے اپنے ہاں کی جدید علمی تحقیقات کی سخت مخالفت کی اور مذہبی عدالتوں کے ذریعہ جدید مفکّرین کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دے ڈالیں، جس کی وجہ سے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحی مذہب اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار

کرلی اور اس آزاد خیالی نے آگے بڑھ کر نہ صرف ان کے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا بلکہ اس نئے دَور کے اہلِ حکمت و فلسفہ نے محض تعصب اور ضد کی بنا پر خدا کی ہستی، روحانیت اور فوق الطبعی طاقت (Super Natural Power) کا بھی انکار کر دیا اور مذہب سے آزاد ہو کر مادہ پرستی کا شکار ہو گئے ان کے فلاسفہ نے ایک خاص تدریج کے ساتھ مغربی معاشرہ کو اس حالت تک پہنچا دیا کہ فلاسفر ڈیکارٹ (متوفی ۱۶۵۰ء) جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل تھا اور مادہ کے ساتھ روح کا بھی مستقل وجود مانتا تھا۔ مگر دوسری طرف اس کائنات کی پیدائش اور مخلوق کے وجود میں آنے کو آٹومیٹک (Automatic) مانتا تھا، جس میں اس کے خدا کا کوئی دخل نہ تھا، اس کے بعد پے درپے ہابز (Halls) سپائنوزا (Spinoza)، لائٹز (Leitnitz) لاک (Locke) جیسے فلسفی اور کوپرنیکس (Copernicus) کیپلر (Kepler) گیلیلیو (Galilau) نیوٹن اور دوسرے سائنس دان اگرچہ خدا کے منکر تو نہ تھے مگر اس کائنات کا نظام چلانے والی کسی دوسری طاقت کی تلاش میں رہتے تھے، ان کے بعد آنے والے فلاسفہ خدا کو اس کائنات کے نظام سے عملاً بے دخل سمجھنے بلکہ خدا کے وجود تک سے انکار کر دینے والے نظریات کی طرف ڈھکتے چلے گئے اور ڈارون کے جاہلی نظریہ ارتقاء نے اس مغربی تہذیب کے ماتھے پر آخری کیل گاڑ دی، کہ انسان اور دوسری مخلوقات کو پیدا کرنے والی کوئی حکیم و دانا ہستی نہیں ہے، بلکہ زمین کے کیڑے خود بخود ترقی کرتے کرتے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے انسان کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اور مادہ ہی اصل چیز ہے، کوئی خدا اور ماورا (Super Natural) طاقت نہیں ہے۔

ڈارون کا یہ نظریہ جو عقل اور مشاہدہ کے سراسر خلاف تھا اور تنقید سے باطل قرار دیا جا سکتا تھا، مادہ پرست ذہنوں نے اسے بڑے شوق سے قبول کر لیا اہلِ مذہب نے ابتداء میں اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹن نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر آخر کار اہلِ مذہب بھی اس سائنٹیفک دہریت کے چرچا سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ء میں جب اسی ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا کہ اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دے دی، حالانکہ یہ شخص یورپ میں ان کے مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے بے دینی کی وہ ذہنیت پیدا کی جس سے بالشوزم اور فاشزم کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

اہلِ مغرب جنہوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں سے ضد اور تعصب کی بنا پر گمراہ کن اور جھوٹے عقائد کا یہ شجرِ خبیث اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا آج خود اس سے بیزار ہیں اس نے ان کی زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی ہے یہ سرمایہ داری کو اپناتے ہیں تو اشتراکیت نمودار ہوتی ہے، جمہوریت کا تجربہ کرتے ہیں تو ڈکٹیٹر شپ پھوٹ پڑتی ہے۔ ان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں ایسے مفاسد پھوٹ پڑے ہیں کہ ان کی زندگیاں سرتاپا مصائب و آلام کا نمونہ بن گئی ہیں۔ ان کے دل بے قرار ہیں اور ان کی روحیں کسی امرت رس کے لئے تڑپ رہی ہیں۔

مشرقی ممالک کی نادانی

پچھلی چند صدیوں میں اہلِ مغرب ماڈرن سائنس اور علوم میں ترقی کرتے رہے، اس دوران مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام کرتے رہے اور مغربی قومیں ترقی کی دوڑ میں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں اور ان کے اقتدار کا جب سیلاب اُٹھا تو ایک صدی کے اندر اندر تمام رُوئے زمین پر چھا گیا۔ یہ مسیحی یورپ، قلم اور تلوار دونوں سے مسلح تھا اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا تھا۔ اس نے مسلمان ملکوں کے اندر بھی ان کے مذہبی عقائد و نظریات کے اندر شکوک و شبہات کی لہریں دوڑا دیں۔ مسلمانوں کے رؤسا اور علماء کے دونوں طبقے چونکہ اپنی ذمہ داری سے غافل ہو چکے تھے، اس لئے مسلمان قوم کے سوادِ اعظم نے اسی سنّت پر عمل کیا جو ہمیشہ کمزوروں کی سنّت رہی ہے کہ جو خیالات، نظریات اور اصول حاکموں کی طرف سے آئیں۔ انہی کو ایمان کا درجہ دے دیا جائے اور غیر محسوس طریقہ سے آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے، ہندوستان کے علماء نے مسلمانوں کو ان لادینی نظریات سے بچانے کے لئے اگرچہ مثالی قربانیاں پیش کیں۔ مگر وہ تنہا اس طوفانی یلغار کے مقابلہ میں جو کبھی لڑائی کیسے لڑ سکتے تھے۔ بہر حال انہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حق کی شمعیں روشن رکھیں جن کی بدولت بیشتر مسلمان ملکوں میں آج اسلامی تحریکیں انگڑائیاں لے کر اٹھنے کی تیاریوں میں ہیں۔

مگر ان ملکوں میں عوام اور خواص کی ایک خاص تعداد ایسی بھی ہے، جو اپنی اسلامی تعلیم کو نظر انداز کر کے جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یا سیر و سیاحت

کے لئے اِن ممالک میں جاتے ہیں اور فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو وہ اہلِ مغرب
کی شائستہ گفتگوؤں، ٹریفک کی باقاعدگی، سوشل خدمات کے سیاسی و اجتماعی
اداروں، تجارتی کمپنیوں کی دیانت و امانت، سائنسی ترقی اور کارخانوں و مشینوں
سے اس قدر مرعوب ہو کر واپس آتے ہیں، کہ اُنہیں خوشنما لباس میں لپیٹے ہوئے
اور میک اپ کی دبیز تہوں میں چھپے ہوئے وہ ناسور نظر نہیں آتے، جن کی ٹیسوں
سے آج مغربی معاشرہ کراہ رہا ہے اور مادہ پرستی کا یہ روگ جن کے لئے جان لیوا
بن گیا ہے۔

مگر مشرقی ممالک کے حکمران اور خواص اپنے ممالک کے اسلامی اخلاق سے
بہرہ ور عوام کو بھی مغرب کے اس زنگ خوردہ رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں
اور قومی وسائل و صلاحیتوں کو اپنی اخلاقی روایات اور شرم و حیا کی فضا کو مٹانے
میں صرف کر دینا چاہتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ مغربی زندگی کی اِس خوبصورت
جھیل کی تہ میں کیسی گندگی پھیل رہی ہے۔ حالانکہ برٹرینڈ رسل جیسے یورپ کے
بلند پایہ مفکر تک اہلِ مغرب کو تنبیہہ کر رہے ہیں، کہ "دنیا کی موجودہ حالت اور
ایٹمی جنگ کا خطرہ یہ بات واضح کرتا ہے کہ اگر سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ اسی
مناسبت سے اخلاقی اور سیاسی ترقی نہ ہوئی تو اس سے دنیا کی تباہی میں اضافہ
ہو سکتا ہے[1]"، وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "سائنس نیکی کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتی، اور
دل بھی اچھی زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا دماغ[2]"۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل
حکومتیں وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں عوام کی روحانی و اخلاقی ترقی کی طرف کوئی
توجہ نہیں دے رہی ہیں، بلکہ عوام کو بداخلاقی و برائیوں کی نہ صرف کھلی چھٹی دے رکھی
ہے بلکہ انہیں ابلاغِ عامہ، اشتہارات فلموں اور گندے رسائل کے ذریعہ اس کی

خوب ترغیب دی جاتی ہے تاکہ مادہ پرستی اور لذت پرستی کے علاوہ ان کو روحانیت یا خدا پرستی کے متعلق کچھ سوچنے کا کوئی موقع ہی نہ ملنے پائے۔

سوشلسٹ ممالک کی گمراہی

یورپین ممالک کا معاشرتی نظام آج جس طرح تلپٹ ہو رہا ہے، سوشلسٹ ممالک کے حالات بھی کہیں اُن سے زیادہ دگرگوں ہیں۔ تھوڑی ہی مدت گذری ہے جب یہ خبر پڑھنے میں آئی تھی کہ روس کے بعض شہروں میں پیدا ہونے والے بچوں میں سے ہر تیسرا بچہ حرامی ہوتا ہے، یعنی دوسرے ملکوں میں تو جوانی کی بے راہ روی اور جذبات کی فراوانی جب عقل پر پردہ ڈالتی ہے تو یہ واقعات اِکّا دُکّا ہوتے ہیں۔ مگر روس میں حرام کاری بھی بھوک کے حساب سے ہوتی ہے اور اس پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہے۔ سوشلسٹ ممالک کی تہذیب کا خمیر بھی چونکہ مغرب کی مادہ پرستی اور خدا دشمنی سے تیار ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنے راہنماؤں کی گمراہیوں میں ترقی کرتے کرتے خدا کے کامل انکار اور اُس سے عناد تک پہنچ گیا ہے چنانچہ نظریۂ کمیونزم کے بانی "مارکس" نے ۱۸۴۱ء میں (جب اس کی عمر ۲۵ سال تھی) یہ کہہ دیا تھا کہ "مذہب پر تنقید علم کی اصل جڑ ہے"۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ ہمیں مذہب کے خلاف بھرپور جنگ حکمت عملی کے ساتھ لڑنی ہوگی، مارکس مذہب اور خدا کا اس حد تک مخالف تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کو الحاد کی تعلیم دی اور اُسے

لے Unpopular essays page 23

ےے The futher of science page 49

خدا کا منکر بنایا اور اس کی شادی بھی ایک ملحد نوجوان سے کی، بعد میں اس کی بیٹی اور داماد دونوں نے خودکشی کر لی اور اپنے پیچھے یہ یادداشت چھوڑی کہ ہم چونکہ عملی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے ہم دونوں برضا و رغبت خودکشی کر رہے ہیں۔

پھر خدا اور مذہب کی مخالفت کر کے مارکس کی اپنی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ شدید نفسیاتی اور ذہنی عدم توازن کا شکار ہو گیا تھا، مارکس کا ساتھی انجلز کہتا ہے کہ وہ تنہائی میں زور زور سے گھونسا مارا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاگل ہے گویا اسے شیطان نے مس کر لیا تھا۔

روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بانی لینن کی مذہب دشمنی کا اندازہ لینن کی بیوی کی کتاب "یادداشت لینن" سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ میرا شوہر پندرہ سال کا تھا کہ وہ مذہب کا مخالف ہو گیا، اس نے صلیب پہننا چھوڑ دیا تھا اور گرجاؤں میں جانا ترک کر دیا تھا، حالانکہ ایسی چھوٹی عمر میں اس وقت اس طرح کا اقدام غیر معمولی بات تھی، لینن کی رائے میں ویسے تو تمام مذاہب قابل مذمت تھے، لیکن وہ اچھے مذاہب کا خاص طور پر دشمن تھا کیونکہ لینن کی رائے میں اس کی اچھائی سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ لوگ اس مذہب کے جھانسے میں آجائیں گے۔ اس لئے اس کا کہنا تھا کہ "ہمیں ہر مذہب سے زیادہ اچھے مذہب سے جنگ کرنی چاہیئے، لینن مذہب سے اتنا عناد رکھتا تھا کہ جب اس کی ماں مر گئی تو اس نے عام مذہبی طریقے سے (جس کی گنجائش روس کے قانون میں تھی) کفن دفن کی بجائے نعش کو جلانے والوں کے حوالے کر دیا، خدا اور مذہب سے اس قدر عناد رکھنے کے باوجود جب وہ خود بیمار ہوا تو اپنی بیماری کے آخری ایام میں ذہنی

سکون کے لیے انجیل طلب کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی پوری زندگی میں مذہب کے خلاف صف آرا رہا تھا۔

مشہور برطانوی سیاست دان سر ونسٹن چرچل لینن کے متعلق اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ اس نے مذہب کو رد کیا، خدا کا انکار کیا، اخلاقیات اور بر سہا برس کی روایات کی تردید کی، روسیوں کے لئے اس شخص کی پیدائش بھی بدبختی تھی تو اس کی موت مزید بدبختی ثابت ہوئی۔

لینن کی موت کے بعد جب سٹالن ملک کا سربراہ بنا تو اُس نے ملک کے اندر خود کو خدائی حیثیت دے دی تھی۔ اس کی شان میں جو تعریف پڑھی جاتی تھی ذرا اس کو بھی پڑھ لیجیئے:۔

"اے عظیم سٹالن، اے عوام کے راہنما تو وہ ہے جس نے انسان کو وجود بخشا (نعوذ باللہ) تو وہ ہے جو زمین کو بار آور کرتا ہے تو وہ ہے جس سے صدیوں کی زندگی عبارت ہے، تو وہ ہے جو بہاروں کو جوبن عطا کرتا ہے، تو ہی بہاروں کا مرکز ہے، سورج کی مانند تو لاکھوں دلوں پر جلوہ فگن ہے" (یہ تعریف ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کے اخبار پرادودا میں شائع ہوئی)

مگر آپ حیران ہوں گے کہ یہی سٹالن جس نے ۲۹ سال تک مسلسل کمیونسٹ روس پر حکومت کی اور سرے سے خدا کے وجود کا بھی قائل نہ تھا۔ جب جنگ عظیم اس کے سر پر مسلط ہوئی تو یہ بھی بے ساختہ خدا کو پکارنے لگا۔ اس واقعہ کا ذکر بھی چرچل نے اپنی کتاب "سیکنڈ ورلڈ وار" کے دوسرے حصے میں صفحہ ۴۳۳ پر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "۴۲ عیسوی میں جب میں نے ماسکو کا سفر کیا اور ہٹلر کو شکست

دینے کے لئے سٹالن کے سامنے جنگی حکمتِ عملی کا ایک خاکہ پیش کیا تو سٹالن کو یہ خاکہ بہت پسند آیا اور اس کی زبان سے نکلا " خدا اس سکیم کو کامیاب بنائے ، سٹالن کی طرف سے خدا کی بالا دست حیثیت کو ایسے موقع پر تسلیم کرنا ، جب ہٹلر کو شکست دینے کے لئے اُسے کوئی حقیقی سہارا نظر نہ آتا تھا ، ظاہر کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور تو موجود ہے جسے مشرق و مغرب کی تمام تر کوششوں کے باوجود لوگوں کے دلوں سے تو کیا اپنے دِل سے بھی کلی طور پر نہ نکال سکا۔

اس سٹالن کے بعد روس کا سربراہ خروشچیف مقرر ہوا ۔ وہ بھی مذہب اور خدا کی دشمنی میں اپنے پیش رو کمیونسٹ لیڈروں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا ۔ اپریل ۱۹۶۰ء میں جب روسی خلاباز یوری گاگرین خلا میں اُڑ کر واپس آیا تو اس وقت اس روسی وزیرِ اعظم نے فرعون کی طرح اعلان کیا کہ " ہمارے خلاباز نے خدا کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کہیں بھی خدا نظر نہیں آیا ۔"

پھر ۱۹۷۹ء میں روس کے موجودہ صدر برزنیف نے تخفیف اسلحہ کانفرنس کے اختتام پر امریکی صدر کارٹر سے طنزاً کہا کہ :

" اگر اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچایا گیا تو پھر ہمیں خدا معاف نہیں کرے گا ۔"

اس طرح سے سوشلسٹ ممالک نے اپنے عوام کے فطری جذبات کو دبا کر اور ان کے ضمیروں کو کچل کر انہیں بے اطمینانی کے گڑھے میں ڈال رکھا ہے اور اس گڑھے کے گرداگرد خاردار تار کا جال بُن دیا ہے تاکہ نہ کوئی اس سے باہر نکل سکے اور نہ کوئی اس کے اندر ہی آزادی سے داخل ہو سکے مگر تابکے ؟

اطمینانِ قلب کے حصول کے لئے مغرب کی سرگردانی

ہمارے اہلِ ثروت اور صاحب بہادر لوگوں کی حالت بھی عجیب ہے کہ وہ اپنے بچوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو انگلش سکولوں میں داخل کرانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کرتے ہیں ——————————— کہ ان کی اولاد کو اسلامی تعلیمات کی نسیم بہار کا کوئی جھونکا نہ لگ جائے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اہلِ مغرب اب اپنی تہذیب اور مادہ پرستانہ افکار سے کس طرح نالاں ہو رہے ہیں اور وہ اب اس راستہ کی تلاش میں ہیں جو دراصل ہمارے پاس موجود ہے اور ہمیں تو اب آگے بڑھ کر ان کی راہنمائی کرنی چاہیئے۔

پچھلے کم و بیش پچاس سال سے اہلِ مغرب کے ذہنوں میں بے اطمینانی اور پریشانی کی کیفیت نے ایک بحران پیدا کر رکھا ہے، ان کو اس بے اطمینانی اور روحانی بے چینی سے نکلنے کے لئے اب ایسے مفکرین پیدا ہو رہے ہیں جن کی کتابوں کو قبولیت عامہ حاصل ہو رہی ہے۔ پہلے جب برٹرنیڈ رسل جیسے اونچے پایہ کے رائٹر اور مصلح اس قسم کے نصیحت آموز مضامین لکھتے تھے تو ان مضامین کی عدم قبولیت کی وجہ سے اُن کو ——————————— Un Popular Essays کا نام دینا پڑتا تھا۔ مگر اب حال یہ ہے کہ ایک ماہرِ نفسیات پروفیسر ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل کے اس قسم کے لیکچرز کو سننے کے لئے عام امریکن ہوٹل والوں کو ایک لنچ کے لئے سو ڈالر تک بخوشی ادا کرتے ہیں اور یہ صاحب (One hundred dollar Man) مشہور ہو چکے ہیں۔ ان کی کتاب (Stay Alive all your life.) کو بے حد

مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک کتاب (The power of positive Thinking) بھی لکھ چکے ہیں۔

ان کتابوں میں انہوں نے لوگوں کو ذہنی پریشانیوں اور دماغی تفکرات اور روحانی بے سکونی کو دور کرنے کی کچھ تدابیر بتائی ہیں۔

انہوں نے اپنی کتاب میں پریشان امریکیوں کے حالات اور بڑی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں جن میں امریکہ کے لوگوں کی ذہنی بے سکونی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے

ڈاکٹر ونسنٹ پیل لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ٹیکساس کے جنوب مغربی علاقہ کے ایک ہوٹل میں لیکچر کے موقع پر ایک شخص نے اپنی کہانی بیان کی کہ کس طرح ایک اچھی کتاب کے مطالعہ نے اس کی زندگی بدل ڈالی اور یہ کہانی بے شمار امریکیوں پر صادق آتی ہے۔

حکایت:۔ کس طرح ایک اچھی کتاب کے مطالعہ نے میری زندگی بدل ڈالی؟

وہ کہنے لگا کہ میں اس شہر میں پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ ایک — (Beggar) یعنی مانگت کی طرح آیا تھا، اپنی اس بات پر ہماری حیرانگی کو دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ میری حالت انتہائی قابلِ نفرت اور قابلِ رحم تھی، اس کی یہ بات ہمارے لئے ناقابلِ یقین تھی کیوں کہ اس وقت ہمارے سامنے ظاہراطور پر ایک نفیس آدمی باتیں کر رہا تھا، اس نے ہمیں بتایا کہ چند سال قبل مغربی ورجینیا میں اُسے کثرت سے شراب نوشی کی عادت پڑ گئی، جس کی وجہ سے اس کی حالت روز بروز کمزور ہوتی گئی، کوئی نئی نوکری بھی میری معاشی حالت کو سنبھالا نہ دے سکی۔ حتیٰ کہ میں بالکل مفلس ہوگیا، میں اپنے بکھرے ہوئے

بالوں کے ساتھ گندی حالت میں گلیوں میں گھومنے لگا، نیم دلی سے کام کی تلاش کرتا، مگر کوئی کام نہ ملتا اور میری بیوی نے بھی مایوس ہو کر مجھے چھوڑ دیا، آخر میں بھی بے گھر ہو کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مایوسی کے عالم میں اپنے شہر کو چھوڑ دیا اور بے مقصد مغرب کی طرف چل نکلا۔ جھاڑیوں اور دیواروں کی آڑ میں رات بسر کر لیتا اور کھانا بھیک مانگ کر کھا لیتا۔ اسی حالت میں ایک دن ایک عورت نے مجھے اپنے مکان کی بالائی منزل سے دیکھ لیا اور کہنے لگی۔ "تم تو ایک خوبصورت نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ یہ حالت تمہیں زیب نہیں دیتی، میں تمہیں ایک ایسی چیز دے رہی ہوں جو تمہاری زندگی بدل سکتی ہے۔ بشرطیکہ تم اس پر عمل کرو، وہ مکان کے اندر گئی، ایک کتاب لے آئی اور کہنے لگی کہ اسے پڑھو، جو کچھ یہ کہتی ہے اس پر عمل کرو اور تم پھر ایک مفید آدمی بن جاؤ گے، میں اس کتاب کو لے کر اپنے پھٹے پرانے کوٹ کی جیب میں ڈال کر پھرتا رہا اور اسے پڑھتا رہا۔ سردی سے بچنے کے لئے کبھی کسی لائبریری میں بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھتا اور میں نے اسے درجنوں بار پڑھا، آخر کار اس کتاب کے سادہ سے پیغام نے مجھ پر اثر کرنا شروع کر دیا اور میرے تاریک خیالات بدلنے لگے اور خود اعتمادی پیدا ہونے لگی، کتاب میں کچھ اس طرح کے پیراگراف تھے کہ "تم خدا کے ساتھ اپنا تعلق بڑھاؤ، اپنے خیالات اور طرزِ زندگی کو بدل ڈالو یقین پیدا کرو اور کامیابی حاصل کرو، پختہ عقیدہ اور یقین کے ذریعے تم اپنے آپ کو بدل سکتے ہو۔" آخر کار میں نے خدا کی عبادت کرنے کی مشق کی اور اپنے عقیدہ کو تازہ کیا، میں نے خلوص کے ساتھ روحانی طریقہ آزمایا اور میرے اندر تبدیلی شروع ہو گئی۔ اس طرح میں پھر نوکری کی تلاش میں اس شہر ٹیکساس میں پہنچا اور مجھے ایک معمولی نوکری مل گئی۔ میں کوشش کرتے کرتے ایک

اچھی کمپنی میں اکونٹنٹ بن گیا، کیونکہ یہ کام میں کچھ نہ کچھ جانتا تھا اور مجھے ایک خوبصورت بیوی بھی مل گئی۔" یہ کہانی بیان کرنے کے بعد اس نے ایک پھٹی پرانی کتاب اپنی جیب سے نکال کر میز پر ہمارے سامنے رکھ دی کہ اس کتاب نے میری زندگی بدل ڈالی، جس میں روحانی علاج بتایا گیا تھا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ امریکہ میں شراب نوشی کی اس حد تک کثرت ہے کہ ایک دفعہ حکومت امریکہ نے اسے قانوناً ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس قانونی پابندی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کے خلاف پروپیگنڈا کے لئے مختلف ذرائع پر کئی سال تک کروڑوں ڈالر صرف کئے مگر بالآخر ناکام ہو کر اُسے قانونی طور پر شراب کو جائز قرار دینا پڑا، جس طرح ہمارے مشرقی ممالک میں تمباکو نوشی اور سگریٹ نوشی کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ اب حکومتوں کو سگریٹ کی ڈبیوں پر اس کے مضرِ صحت ہونے کے فقرات درج کرنے کا حکم دینا پڑا ہے۔ مگر اس طریقہ سے کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا ہے اور دوسری طرف آپ نے ایک نوجوان کی حکایت سے اندازہ لگایا ہوگا کہ کس طرح ایک مذہبی اور روحانی کتاب نے اس سے شراب نوشی کی عادت ترک کرا دی۔

ڈاکٹر ونسنٹ پیل نے اپنی کتاب میں بے شمار پریشان حال اور پریشان فکر لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں اور ایک مذہبی اور ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے ایسے غیر مطمئن لوگوں کو جو مشورے دیتے ہیں اُن کا لُبِ لُباب یہ ہے۔

نفسیاتی علاج

ڈاکٹر ونسنٹ پیل پہلے نمبر پر نفسیاتی طریقہ سے اپنے قارئین کی سوئی ہوئی خوابیدہ ذہنی قوتوں کو بیدار

کر کے اُن کے ذہنوں میں خود اعتمادی اور یقین پیدا کر کے ان کے احساسِ کمتری کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کو یقین و اعتماد پیدا کرنے کی مشق کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ :-

ذہنی پریشانیوں کا بڑا سبب ایک قسم کا خوف ہوتا ہے اور اس خوف کو ختم کرنے اور ذہنی پریشانیوں کو دُور کرنے کا بنیادی راز خود اعتمادی ہے۔

انہیں مایوسی کا شکار ہو کر غلط کام کر گذرنے سے بچاؤ کا یہ طریقہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کے منفی جذبات پر قابو پا کر اور ان کو اپنے ذہن سے نکال کر، اُن کی جگہ مثبت اندازِ فکر کو فروغ دینے کی کوشش کریں اور اس کے لیے بھی مسلسل مشق کرتے رہیں۔

وہ انہیں اپنی زندگی میں پیش آنے والے مصائب اور پریشانیوں کو دُور کرنے کا یہ علاج بتاتا ہے کہ وہ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا الزام دوسروں پر تھوپنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ، ان کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو قرار دے اور خود ہی ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اندر حوصلہ پیدا کرے تاکہ دوسرے لوگوں پر اپنی غلطیوں کا الزام لگانے سے ان کے ساتھ اس کے تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔ دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات اُسے اپنی آئندہ زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ پہ کام دے سکتے ہیں۔

وہ ان کے سامنے امریکہ کی تاریخ کے ایک بہت بڑے مفکر "ولیم جیمز" کا یہ مقولہ پیش کرتا ہے "کہ آپ کسی بھی منصوبہ پر کامیابی کے ساتھ اُسی وقت عمل کر سکتے ہیں، جب آپ کو یقین ہو کہ آپ یہ کام کر سکتے ہیں" یعنی کامیابی ان کے قدم چومتی ہے جو اپنی کامیابی پر یقین رکھتے ہوں۔

خدا کے ساتھ تعلق

اس قسم کے متعدد نفسیاتی تجاویز کے بعد وہ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے خدا کے ساتھ بھی تعلق قائم کریں تاکہ ان کو روحانی امداد حاصل ہو سکے۔

وہ انہیں بتاتا ہے کہ مایوس ہو کر غلط کام کر گذرنے سے بچاؤ کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ دن میں روزانہ کئی بار یہ الفاظ دہرا کر اپنے خدا کو یاد کرتے رہیں "کہ خدا مجھے اطمینان دینے والا ہے"

خدا کے متعلق یہ بات بھی ذہن نشین کراتا ہے "کہ خدا ہر اس شخص کی امداد کرتا ہے جو اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے حوالے کر دے یعنی اس کے کاموں پر راضی ہو جائے"

وہ بتاتا ہے کہ خدا کی امداد حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی کو خدا کے قوانین کا پابند بنائیں، پھر اپنی روحانیت کو مضبوط کریں اور اپنے ذہن سے غلط عقائد و خیالات نکال دیں۔

خدا کی طاقت و قوّت خود تمہارے تحت الشعور میں ہوتی ہے اور وہ آپ کی امداد کے لئے اس وقت آتی ہے، جب آپ کا عقیدہ اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھو کہ خدا کی بادشاہی خود تمہارے اندر موجود ہے۔

اپنے غموں کو خدا کے حوالے کر کے مطمئن ہو جائیں کہ وہ انہیں دُور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اگر اس کی یہ مرضی ہوگی کہ آپ ان غموں اور مصائب کا مقابلہ کریں تو وہ آپ کو اس کی طاقت بھی دے دے گا۔ پھر آپ دوسروں کے لئے بھی دعا کرنا سیکھیں، جب یہ دوسرے بھائیوں کی ہمدردی اور محبت کے جذبات آپ کے دل میں پیدا ہوں گے تو اطمینان بخشنے والی قوتیں خود آپ کی بھی امداد کریں گی۔

خدا کی عبادت

تیسرے نمبر پر وہ اپنے قارئین کو خدا کی عبادت کرنے کا راستہ بتاتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ رنج وغم کو دُور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ خدا کی عبادت کریں —— اس طرح آپ اپنے خدا سے امداد طلب کرنے کے حقدار ہو جائیں گے کہ وہ آپ کے غموں و پریشانیوں کو دُور کرے۔

وہ ان کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اکثر گرجاؤں میں جایا کریں اور بائیبل کے روح پرور مضامین پر غور کریں۔

وہ لکھتا ہے کہ یہ بائیبل ہمیں "خدا پر بھروسہ اور توکل" کے ذریعہ قوتِ ایمانی کے حصول کا راستہ بتاتی ہے۔ جس کے ذریعہ ہم اپنی ذہنی بے اطمینانی کو ختم کر سکتے ہیں۔

پھر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سچا ایمان لانے کو روحانیت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ قرار دیتا ہے۔

مسٹر "ڈیل کارنیگی" امریکہ کے مشہور زمانہ ماہر نفسیات (سائیکالوجسٹ) نے بھی اس موضوع پر کچھ کتابیں لکھی ہیں جو مغربی ملکوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں اور پاکستان میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ یہ بھی جب کبھی اپنے تعلیمی اداروں کی طرف سے کوئی جلسہ کرتے ہیں تو اس میں کثیر تعداد میں لوگ شامل ہوتے ہیں۔

انہوں نے حسب ذیل عنوانات پر کتابیں لکھی ہیں۔

"زندہ رہنا بھی ایک فن ہے" از ڈیل کارنیگی

"کامیابی کے راز"

"میٹھے بول کا جادو"

"پریشان ہونا چھوڑیے" از ڈیل کارنیگی

"ترقی کی راہ پر"

"سو سال تک زندہ رہیئے" لیوجی کاریزو وغیرہ وغیرہ

ان ماہرین کی کتابوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ اور مفاد پرستانہ ہے، ان کے نزدیک دنیا کے کامیاب ترین انسان وہ ہیں جو زیادہ دولت کے مالک، بڑے کارخانہ دار، بڑی بڑی کمپنیوں کے منیجر، امریکہ کے صدر اور بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے مالک ہیں۔ ان ماہرین نفسیات نے ——— خوش خلقی، نرم مزاجی، حسن سلوک، دیانتداری سماجی خدمت وغیرہ اچھے اخلاق کو اگر اپنانے کی ترغیب دی تو وہ بھی اپنے کاروبار چمکانے کے لئے، ایک کارخانہ کے مالک کو اپنے کاریگروں سے اچھا سلوک کرنے کے لئے اس خاطر ہدایت دی کہ اس کے کاریگر اس طرح محنت اور لگن سے کام کریں، ان ماہرین نفسیات کی کتابوں میں کہیں بھول کر بھی خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ادبی چاشنی سے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہی ڈیل کارنیگی صاحب اپنی کتاب "ترقی کی راہ پر" کے پہلے صفحہ میں کتاب کے لکھنے کا مقصد یوں بیان کرتے ہیں۔

"کہ ہر آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ترقی کر کے کامیاب زندگی بسر کرے، خوشحالی، آسودگی، آرام و راحت اور سکون و اطمینان ترقی اور کامیابی سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں، یہ نعمتیں دولت سے حاصل کی جا سکتی ہیں، دولت، خوشحالی کا دوسرا نام ہے، اسی سے آرام و آسائش کی چیزیں میسر آتی ہیں، انہی چیزوں کی مدد سے زندگی راحت آرام سے گذاری جا سکتی ہے۔ اسی طرح دلی خوشی بھی ایک ایسی نعمت ہے جس کے لئے سب انسان زندگی بھر آرزومند

رہتے ہیں، آج کل اس کا انحصار بھی مادی چیزوں پر ہی ہے۔ اور یہ چیزیں روپے پیسے سے فراہم ہوتی ہے اسلئے دولت ہی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

مگر آج کا مغربی معاشرہ بھی ان مادہ پرست ماہرین نفسیات کے خیالات سے متفق نظر نہیں آتا اور وہ دولت کی فراوانی یا مادی وسائل کی زیادتی کو سکون و اطمینان کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ وہ اب روحانی راہنمائی کا متمنّی ہے۔ جس کی کوشش پروفیسر ڈاکٹر ونسنٹ پیل نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ مگر ان مذہب پسند عیسائی مفکرین کی دشواری یہ ہے کہ اگرچہ یہ خدا کو مانتے ہیں، خدا کی عبادت اور گرجا کو پسند کرتے ہیں، روحانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں خدا کی وحدانیت کا تصوّر بھی صاف نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ان کے عقائد میں بہت خامیاں ہیں، ان کی کتاب انجیل مقدس بھی ان کے پادریوں کا تختۂ مشق بنی رہی ہے اس میں کافی تحریفیں کردی گئی ہیں۔ یعنی ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہے۔ اس لیئے ان مذہب پسند عیسائی مفکرین کو اپنے مذہبی عقائد کی بھی کافی چھان پھٹک کرنی پڑے گی اور اس معاملہ میں خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور قرآن پاک ہی ان کی صحیح راہنمائی کر سکے گا جو کہ اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب "بالِ جبریلؑ" میں کیا خوب کہا ہے۔

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کے دورِ عروج میں جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے لئے پادریوں کا سیلاب آگیا تھا، ہندوستان کے عالم دین "مولانا شرف الحق قادری صابری" جو مولانا حالی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے۔ متعدد عیسائی پادریوں سے مناظرے کئے اور اُن میں سے ہر ایک کو لاجواب کر دیا، ۸ مارچ ۱۸۸۵ء میں دن کے تین بجے اُن کا ایک مناظرہ پادری روفنس صاحب سے ہوا۔ ان پادری صاحب نے تین گھنٹے کی بحث کے بعد لاجواب ہو کر آخر میں تئیس ہزار کے مجمع میں اپنا اعتراف شکست ان الفاظ میں کیا: "ہم میں اس قدر علم ولیاقت نہیں ہے کہ مولانا صاحب سے مقابلہ کر سکیں، مولانا صاحب نے ہمارے مذہب میں ایسی تحقیق اور وسیع معلومات حاصل کی ہیں جس کے لئے مولانا موصوف آفرین صد آفرین ہیں۔"

اسی طرح ۱۸۹۱ء میں مسجد شاہی فتحپوری دلی میں مولانا صاحب کا لارڈ بشپ جے ای لیفرائے سے مناظرہ ہوا، دلی اور اطرافِ دہلی میں اس مناظرے نے ہلچل مچا دی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ پادری صاحب اور مولانا کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ جو شخص مناظرہ میں ہار جائے گا، وہ مجمع عام میں اپنی شکست کا اعتراف کرے گا اور شکست نامہ لکھ کر دے گا، نیز ہارنے والا مقابل کے مذہب کو اختیار کریگا۔"

یہ مناظرہ دو دن جاری رہا اور اس میں سامعین کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار ہو گی دوسرے دن کے مناظرہ کی بحث میں ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ مولانا شرف الحق صاحبؒ نے اپنے مدِمقابل لیفرائے کو شکست دے دی، اس نے حسب وعدہ اپنے مذہب کو تو نہ بدلا، لیکن تسلیم کر لیا، کہ واقعی انجیل شریف میں تحریف ہوئی ہے اور حسب ذیل شکست نامہ لکھ کر دیا۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ لوقا کی انجیل شریف کے ترجمے اور اس کے متعدد اصلی نسخوں میں، جو اس وقت موجود ہیں، ان میں چند آیتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کی گئی ہیں، یہ بات سب قدیم نسخوں، ٹریکٹوں کے ملانے سے معلوم ہوئیں، وہ آیتیں ان میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا میں اصل انجیل کی باتیں سچی مانتا ہوں۔ مستشرقین شعراء کے قول انجیل میں ملے ہوئے ہیں۔" دستخط جے۔ای۔لیفرائے

(لارڈ بشپ)

اطمینانِ قلب کی عظمت

یہ "اطمینانِ قلب" کے حصول کی خواہش انسان کی ایک مقدس ضرورت ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے بھی، جو انسان کے خالق اور رازق ہیں نظر انداز نہیں فرمایا ہے۔ جب بھی خدا کے کسی صالح بندے نے خدا کے سامنے کسی معاملے میں اطمینان حاصل کرنے کی آرزو کا اظہار کیا، اللہ تعالیٰ نے بکمالِ مہربانی اس کی اس خواہش کو پورا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ جو بلا شرکتِ غیرے تمام انسانوں کے خالق، رب، مالک، بادشاہ اور سچے حاکم و فرمانروا ہیں، اگر چاہتے تو اپنی کتابوں میں انسانوں کے لئے اپنے احکام پر مشتمل قوانین و ضوابط کی ایک فہرست نازل فرما دیتے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کو محض یہ حکم فرما دیتے ہیں، کہ یہ میرے قوانین ہیں ان کی پابندی کرو، تو خدا تعالیٰ اس بات کا حق رکھتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مجازی حکمرانوں کی طرح محض قوانین شائع نہیں کر دیئے، بلکہ اس نے بھی اپنے احکام نازل کرنے یا اُن احکام کی پابندی کا حکم دینے سے قبل لوگوں کے سامنے بے شمار دلائل پیش کئے، اُن کے ذہنوں کے اطمینان کے لئے دلائل میں مختلف اسلوب و انداز اختیار کئے، گذشتہ زمانوں کے واقعات بیان کئے، ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کے بُرے انجام بتائے اور ترغیب و تحریص کے

مختلف طریقے اختیار کیئے، تاکہ لوگ "اطمینانِ قلب" کے ساتھ اپنے خالق کے احکام کی اطاعت کا راستہ اختیار کر سکیں۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ اللہ تعالٰے نے اپنے پیغمبروں کو اگرچہ پردۂ غیب کی بعض حقیقتوں کا براہِ راست مشاہدہ کرا دیا تھا، مگر جب بھی کسی نبی نے کسی معاملہ میں اپنے مزید ذہنی اطمینان کی آرزو کا اظہار کیا، تو اُن کی اس خواہش کو بھی مسترد نہیں فرمادیا، بلکہ نہایت مؤثر طریقہ سے ان کے ذہنی اطمینان کے اسباب فراہم کر دے۔

ایک مثال

اور اے نبیؐ، ذرا وہ واقعہ بھی آپ کے پیشِ نظر رہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ "میرے مالک مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا، "کیا تُو ایمان نہیں رکھتا؟" اُس نے عرض کیا" ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" فرمایا "اچھا، تو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے سے مانوس کر لے، پھر اُن کو (ذبح کر کے) ان کے گوشت کو آپس میں ملا کر، گوشت کا ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے، خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔" (پارہ ۳ ۔ رکوع ۔ ۳)

دُوسری مثال

قرآنِ پاک میں ہی دوسری مثال یہ بیان کی گئی ہے کہ "یا پھر مثال کے طور پر اُس شخص کو دیکھو، جس کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اُس نے کہا" یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟" اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سو برس تک وہاں پر مردہ پڑا رہا، پھر اللہ نے

اُسے دوبارہ زندگی بخشی اور اُس سے پوچھا "بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟" اس نے کہا "ایک دن یا چند گھنٹے رہا۔" فرمایا تم پر سو برس اسی طرح گذر چکے ہیں، اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو، کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے، دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ سب کام ہم نے اس لئے کیا ہے، کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ تمہارے گدھے کی ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا "میں جانتا ہوں اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

(بعض مفسرین نے اس قصہ کو حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے)

(پارہ ۳۔ رکوع ۳)

تیسری مثال اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السّلام کی اُن ذہنی پریشانیوں اور بے اطمینانیوں کو دُور کرنے کے لئے جو انہیں علم کی کمی اور پردۂ غیب کی حکمتوں کو نہ سمجھنے کی بناء پر لاحق ہو جاتی تھیں کس طرح حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقت کا انتظام کر دیا۔

قدرت کے راز

قرآن کریم کے پندرھویں پارہ کے رکوع ۲۰ اور ۲۱ میں اور سولھویں پارہ کے پہلے رکوع میں اس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے

ایک شخص نے اس وقت دریافت کیا اے موسےٰ! کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہے، آپ نے اس کا جواب نفی میں دیا، تب اُن پر اللہ کی طرف سے وحی آئی، کہ جس جگہ دو سمندر ملتے ہیں، اس کے نزدیک ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، ان دو دریاؤں یا سمندروں کے ملنے کی جگہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں خلیج عقبیہ اور نہر سویز ملتی ہیں، یہ جزیرہ نمائے سینا کو گھیرے ہوئے ہے جہاں کہ بنی اسرائیل کئی سال تک گھومتے رہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی کہ مجھے اس مقام کا پورا پتہ بتایا جائے۔ حکم ہوا کہ ایک تلی ہوئی مچھلی اپنے ساتھ لو۔ جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہاں وہ شخص موجود ہے۔ اس پر حضرت موسےٰ علیہ السلام نے حضرت یوشعؑ کو ساتھ لے کر اس ہدایت کے مطابق سفر شروع کیا۔ ایک جگہ ایک پتھر کے نزدیک جہاں کہ ایک چشمہ جاری تھا، حضرت موسےٰ سو رہے تھے۔ حضرت یوشعؑ نے دیکھا کہ وہ تلی ہوئی مچھلی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی، حضرت یوشعؑ بہت حیران ہوئے۔ مگر جب حضرت موسیٰؑ بیدار ہوئے انہیں اس بات کی اطلاع دینا بھول گئے اور دونوں آگے چل کھڑے ہوئے۔ بہت فاصلہ طے کر گئے۔ حتیٰ کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے تھکاوٹ محسوس کی اور کھانا طلب کیا۔ اس وقت حضرت یوشع علیہ السلام نے کہا کہ افسوس مچھلی تو جہاں آپ نے استراحت کی تھی، زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی اور میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا بھول گیا، دونوں اُلٹے پاؤں لوٹے، اس پتھر کے پاس آئے، وہاں ایک بندۂ خدا سے ملاقات ہوئی جنہیں عام طور پر حضرت خضر علیہ السلام کہا جاتا ہے حضرت موسےٰ علیہ السلام نے اپنی آمد کی وجہ بیان کی، حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ واقعی اللہ

تعالیٰ نے آپ کی تربیت کی ہے لیکن اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے مجھے ایک علم عطا ہوا ہے، جو تمہیں نہیں ملا۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو چند یوم آپ کے ساتھ رہ کر اس علم کو حاصل کر وں، انہوں نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ نہ ٹھہر سکو گے، کیوں کہ اس علم کا سمجھنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضرؑ مان گئے مگر نصیحت کی کہ کسی چیز کے متعلق روک ٹوک نہ کریں اور کچھ دریافت نہ کریں جب تک کہ میں خود اس کا ذکر نہ کروں۔ خیر موسیٰؑ نے وعدہ کیا، دونو روانہ ہو گئے۔ پار جانے کے لئے ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ حضرت خضرؑ نے جب کشتی کنارہ پر لگی۔ اس کا ایک تختہ نکال دیا، اس طرح اس میں سوراخ کر کے اُسے عیب دار کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑا اچنبھا ہوا اور یوں گویا ہوئے کہ آپ نے یہ عجیب کارنامہ کیا ہے کہ اس سے لوگوں کو ڈبو دیا جائے۔

حضرت خضرؑ بولے کہ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ تم سے صبر نہیں ہو سکے گا اور میرے ساتھ تمہارا رہنا مشکل ہو گا، حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ مجھے بھول ہوئی۔ اس لئے مواخذہ نہ کیجئے۔

پھر دونوں روانہ ہوئے، ایک گاؤں میں پہنچے، وہاں چند لڑکے کھیل رہے تھے، حضرت خضرؑ نے اُن میں سے جو زیادہ سیانا اور خوبصورت تھا، پکڑا اور جان سے مار ڈالا اور چل کھڑے ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے آپ نے ایک پاک جان کو مار ڈالا، اس سے بڑھ کر ناپسندیدہ کام کون سا ہو سکتا ہے؟ حضرت خضرؑ نے فوراً جواب دیا کہ میں نے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں ٹھہر

سکو گے، حضرت موسےؑ نے فرمایا، اچھا اگر میں دوبارہ کوئی بات پوچھوں، تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں۔

دونوں چل پڑے۔ ایک گاؤں میں پہنچے، انہوں نے گاؤں والوں سے کھانا مانگا مگر اہلِ دیہہ نے کھانا کھلانے سے انکار کر دیا، حضرت موسےؑ کو یہ ناگوار گذرا اور دونوں چل دیئے۔ گاؤں کے پاس سے گذرے تو ایک خستہ مکان نظر آیا، اس کی دیواریں چند ہی یوم میں گرتی نظر آتی تھیں۔ حضرت خضرؑ وہاں کھڑے ہو گئے اور دیوار کی مرمت شروع کر دی اور اُسے مضبوط کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ کو غصہ آیا اور کہنے لگے، اس سے بہتر تھا، کہ مزدوری لے لیتے، اس پر حضرت خضرؑ نے کہا کہ اے موسےؑ آپ نے پھر میرے کام پر نکتہ چینی کی ہے اور اعتراض کیا ہے۔ بس تیرے اور میرے درمیان اب جدائی ہے مگر تجھے علیحدہ کرنے سے پہلے، ان باتوں کا راز تجھ پر افشا کئے دیتا ہوں۔

(۱) کشتی میں اس لئے سوراخ کیا تھا کہ وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی جو مشکل سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ حاکمِ وقت چاہتا تھا کہ اس کشتی کو بیگار میں پکڑے ہم نے اُسے عیب دار کر کے نکما کر دیا۔ اس طرح اُسے بیگار سے بچا لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یتیموں کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔

(۲) بچے کو بھی بے وجہ قتل نہیں کیا گیا تھا، اس کے ماں باپ بڑے نیک تھے۔ مگر وہ بڑا شریر تھا، ماں باپ کو بدنام کر رہا تھا، ہم نے اس لئے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا، اللہ تعالےٰ انہیں اس کے بدلے میں نیک اولاد دے گا۔

(۳) دیوار کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ دو یتیم بچے اس کے مالک تھے۔ اس

کے نیچے ایک خزانہ دفن تھا، اُن کا باپ جو مر چکا تھا بہت نیک تھا، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جب تک وہ بالغ نہ ہو جائیں، کسی کو خزانے کا علم نہ ہو۔ اس لیے اس دیوار کا مرمت کرنا، میری اپنی مرضی سے نہ تھا، جس طرح اللہ جل جلالہٗ نے چاہا میں نے کر دیا۔ یہ تین بھید تھے جن پر آپ صبر سے غور نہ کر سکے اور نہ ان کے راز کو سمجھ سکے۔ پارہ ۱۵ رکوع ۲۱ پارہ ۱۶ رکوع ۱۔)

پہلی دو مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے پیغمبروں کو جن عقائد (افکار و نظریات) کی تبلیغ کے لئے مقرر کیا جاتا ہے، اگرچہ اُن امورِ غیب سے متعلق عقائد سے اُن کو اللہ تعالےٰ ان سے براہِ راست کلام فرما کر یا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ اُن کو باخبر کر چکے ہوتے ہیں۔ مگر جب بھی وہ اس عقیدہ کے متعلق کہ "مردہ چیزوں کو اللہ تعالےٰ دوبارہ کس طرح زندہ کر دیں گے؟ مزید اطمینان کا مطالبہ کرتے ہیں تو اُن کو عینی مشاہدہ کرانے کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ پورے یقین کے ساتھ ان عقائد و ایمانیات کی تبلیغ کر سکیں" کافر لوگ نبیوں سے بار بار یہ سوال کیا کرتے تھے، کہ مرنے کے بعد اُن کو دوبارہ زندگی کس طرح مل سکے گی۔ جب کہ اُن کی ہڈیاں قبروں میں گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں گی؟ ان دو مثالوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو انبیاءؑ کے دلوں میں اسی عقیدہ کے متعلق عین الیقین پیدا کر دیا اور عام لوگوں کے اعتراضات کا بھی شافی جواب دے دیا۔

تیسری مثال سے عام لوگوں کی اُن ذہنی پریشانیوں اور بے اطمینانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو انہیں خدا کے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لاحق ہوتی رہتی ہیں کہ وہ خدا کے کاموں پر ہر حال میں مطمئن رہیں

اور پریشانیوں اور مصائب میں صبر کرتے رہیں۔ ہلکان اور پریشان نہ ہوتے پھریں

پریشان کن حالات

ان تین مثالوں کے علاوہ اور بھی بے شمار مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ کس طرح اللہ تعالےٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کے لئے زندگی کے مختلف پریشان کن حالات میں ان کے اطمینان قلب کے سامان فراہم کرتے رہے ہیں۔

غارِ ثور کی مثال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ شریف کے سفر پر تھے اور قریشِ مکہ آپ کا تعاقب کر رہے تھے اور انہوں نے حضورؐ کو گرفتار کر کے لے آنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات بھی مقرر کر رکھے تھے۔ اس سفر کے دوران جب حضورؐ اپنے واحد ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ غارِ ثور میں استراحت کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے تو دشمن آپ کو تلاش کرتے کرتے غارِ ثور کے دہانے پر آپہنچے کہ دشمنوں کے پاؤں تک غار کے اندر سے نظر آرہے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ اگر کہیں دشمنوں نے غار کے اندر جھانک کر دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اس پر حضورؐ نے اپنے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ کہ خوف نہ کر خدا ہمارے ساتھ ہے اور اس کی امداد ہمیں حاصل ہے۔ ایمان اور توکل میں ڈوبے ہوئے اس فقرہ کی بناء پر اللہ تعالےٰ نے اُن کے دل پر سکونِ قلب کی ایک لذیذ کیفیت طاری کردی۔ اور وہ سمجھ گئے کہ!

جو خدا ان کو کفارِ مکہ کے قتل کے منصوبہ اور سازش سے بچا کر صحیح و سلامت

یہاں پر لے آیا ہے۔ وہ خدا یہاں پر بھی ان کی حفاظت فرمائے گا۔

دشمن اگرچہ غار کے منہ پر آن پہنچے ہیں۔ مگر چونکہ تمام انسانوں کے قلوب پر تصرف کرنے کے اختیارات بھی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان دشمنوں کے دلوں میں یہ خیال ہی پیدا نہ ہونے دے گا کہ وہ ذرا جھک کر اس غار کے اندر دیکھ لیں۔

حضورؐ کے اس فقرہ نے اُن پر یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ دنیا کی کوئی طاقت بھی کسی انسان کو اس وقت تک کوئی نفع یا ضرر نہیں پہنچا سکتی، جب تک اُن کے خدا کو ہی ایسا منظور نہ ہو۔

ایمان اور توکل کی اس کیفیت نے ان کے دلوں کو سکونِ قلب کی نعمت سے سرشار کر دیا۔ اور دشمن بھی بغیر ان کو دیکھے واپس چلے گئے۔

غزوۂ حنین کی مثال

یہ غزوہ شوال ۸ھ میں مکّے اور طائف کے درمیان وادیٔ حنین میں پیش آیا تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی طرف سے ۱۲ ہزار فوج تھی، جو اس سے پہلے کبھی کسی اسلامی غزوہ میں اکھٹی نہیں ہوئی تھی اور دوسری طرف کفّار ان سے بہت کم تھے مگر اس کے باوجود قبیلۂ ہوازن کے تیر اندازوں نے راستہ کی مختلف پہاڑیوں پر پوزیشن سنبھال کر مسلمان لشکریوں پر اس طرح تیر اندازی کی کہ ان کا منہ پھیر دیا اور لشکرِ اسلام بُری طرح تتر بتر ہو کر پسپا ہوا۔ اس وقت صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور چند مٹھی بھر جانباز صحابہؓ تھے، جن کے قدم اپنی جگہ جمے رہے اور انہی کی ثابت قدمی کا نتیجہ تھا کہ دوبارہ فوج کی ترتیب قائم ہو سکی اور بالآخر فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی، ورنہ فتح مکّہ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا اس سے بہت زیادہ حنین

میں کھو دینا پڑتا۔

"اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر (اطمینانِ قلب اور سکونِ قلب کے ذریعہ) تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں"

اللہ تعالیٰ نے سچے ایمان کی بدولت صحابہ کرامؓ پر اطمینانِ قلب اور سکینت کی یہ نعمت اس قدر وافر مقدار میں نازل فرما دی تھی کہ عین میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی کی حالت میں صحابہ کرامؓ پر اونگھ کی کیفیت تک طاری ہو جاتی تھی جب کہ اُن کی تلواریں دشمن پر یلغار میں مصروف ہوتی تھیں۔

دورِ صحابہ کے بعد بھی ہر زمانہ میں اہلِ ایمان اور علمائے حق پر نہایت مشکل حالات میں بھی اطمینانِ قلب کی یہ کیفیات طاری نظر آتی ہیں جن کی مثالیں ہر زمانہ کی تاریخ سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

علمائے ہند کی مثال

اسی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کے علماء نے عَلَمِ جہاد بلند کیا اور اس لڑائی کے نتیجہ میں جب پٹنہ اور تھانیسر کے بعض علماء کو گرفتار کر کے جالندھر میں ان کے خلاف مقدمۂ بغاوت چلایا گیا تو اس مقدمۂ بغاوت کی روداد لکھتے ہوئے ایک انگریز "ولیم ہنٹر" نے لکھا ہے کہ

جب ہم نے مقدمۂ بغاوت کے نتیجہ میں اِن علماء کو سزائے موت کا حکم سُنایا اور ان کو گیروا لباس پہنا کر انبالہ جیل کی پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند کیا تو جیل کے افسروں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جوں جوں ان علماء کی پھانسی کی تاریخ قریب آتی تھی ان کے وزن بڑھتے جاتے تھے اور وہ صحت مند اور خوش و خرّم نظر آتے تھے۔ اس دوران جب وائسرائے ہند نے اپنی بیوی کے ساتھ انبالہ جیل کے معائنہ کے دوران پھانسی کے ان قیدیوں سے ملاقات کی اور ان کے کاغذات دیکھے کہ کس خوشی کی وجہ سے دن بدن ان کے وزن بڑھتے جا رہے ہیں تو وائسرائے کی بیوی نے ان علماء سے سوال کیا کہ آپ کی موت کا وقت قریب آ رہا ہے آپ کو تو غمگین و پریشان ہونا چاہئیے، یہ کیا بات ہے کہ آپ کے وزن خوشی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں؟ تو اُن علماء نے جواب دیا کہ ہم اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھ رہے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں ہمیں شہادت کی موت نصیب ہونے والی ہے۔ اور اپنے خدا سے جلدی ہی ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس لئے ہم اس تاریخ کا شدّت سے انتظار کر رہے ہیں جب آپ لوگ ہمیں پھانسی پر چڑھا دیں گے۔

عُلمائے حق کی یہ باتیں سُن کر جب وائسرائے اور اس کی بیگم اپنے جگہ پر پہنچے تو انہوں نے ان قیدی علماء کے معاملات پر اس پر اس دشمنی کے جذبہ کے تحت غور کیا، جو انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بھڑک رہا تھا۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اِن مسلمان علماء کو پھانسی کی وہ سزا ہرگز نہیں دینی چاہئیے جس کی خوشی سے ان کے وزن تک بڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس انگریز وائسرائے نے اپنے جذبہ عناد کے تحت ان علمائے حق کی سزائے

موت منسوخ کر دی اور ان کی سزائے موت کو جزائر انڈیمان (کالے پانی) کی جلا وطنی کی سزا سے تبدیل کر دیا۔

اس طرح ہندوستان کے یہ علمائے کرام (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) اس اطمینانِ قلب اور سکینت کی بدولت جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں بھر دی تھی، پھانسی کی سزا سے بچ گئے۔

اطمینانِ قلب کی اس تقدیس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ہونے والے اہلِ ایمان کو اس نعمت کی ان الفاظ میں بشارت دے رکھی ہے۔

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

"اچھی طرح سے سن لو! جو اللہ کے دوست ہیں (اور اللہ کے دوست وہ ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری کا رویّہ اختیار کیا، اُن کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں اُن کے لئے (اطمینانِ قلب اور سکینت) کی بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدلا نہیں کرتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

(پارہ ۱۱۔ سورہ یونس۔ آیت ۶۲-۶۳، ۶۴)

اطمینانِ قلب کی عظمت

اطمینانِ قلب کی عظمت کے پیشِ نظر خود اللہ تعالےٰ نے بھی اس کے حصول کے مختلف طریقوں کی طرف راہنمائی فرمائی ہے اور اس کے بلند درجات کا ذکر بھی فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اپنی عملی زندگی اور اسوۂ حسنہ کے ذریعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں "اطمینانِ قلب" کی وہ روح پھونکی جو قیامت تک "اطمینانِ قلب" کے متلاشیوں کی راہنمائی کرتی رہے گی، ان طریقوں پر مفصّل بحث انشاء اللہ تعالےٰ ہم آئندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔ فی الحال اطمینانِ قلب کی عظمت ملاحظہ فرمائیں۔

اطمینانِ قلب کی دولت سے مالامال نفس کے بلند درجات کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:۔

"یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝" (پارہ ۳۰ سورہ الفجر)

قیامت کے روز جب گنہگار لوگ بُرے حال میں ہوں گے اور دوزخ میں جانے کے منتظر ہوں گے (نعوذ باللہ) تو اُس وقت نفس مطمئن سے اللہ تعالیٰ مخاطب ہو کر فرمائیں گے۔

"اے نفسِ مطمئنہ! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تُو اپنے نیک انجام سے خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا، میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا، میری جنّت میں۔"

قیامت کے روز "نفسِ مطمئنہ" کے بلند درجات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مہمانی اور انعامات کا اندازہ لگائیے، کیا ایسے شخص سے بھی زیادہ کوئی خوش نصیب اور نیک بخت انسان ہو سکتا ہے جس کے میزبان اور مہربان خود اللہ تعالےٰ ہوں۔

"نفسِ مطمئنہ" کی تشریح آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔ یہاں پر صرف یہ بات ذہن نشین رکھیئے کہ "نفسِ مطمئن" سے مراد ـــ وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے یقین، اطمینان اور ٹھنڈے دل سے "اسلام" کے صراطِ مستقیم کو اختیار کیا ہو اور اپنی زندگی کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کو قرار دے کر ہر قسم کے حالات میں ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا ہو۔

"اطمینانِ قلب" کے موضوع کے متعلق ان تمہیدی مباحث کے بعد اب ہم آپ کے سامنے وہ بنیادی باتیں پیش کریں گے۔ جن کا تعلق براہِ راست ہمارے اس موضوع کے ساتھ نہایت گہرا ہے۔

حضرتِ انسان کے عناصرِ ترکیبی

اطمینانِ قلب کی بحث کو آگے بڑھانے کے لئے یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اجزائے ترکیبی پر بھی مفصل بحث کر لی جائے کہ انسان کا جسم کِن اجزا سے مرکب ہے؟ اور ان میں سے ہر عنصر کا انسانی جسم کے اندر کیا کردار ہے؟ اور کیا مقام ہے؟ تاکہ انسانی جسم کے اندر ہر ہر عنصر کے اطمینان کی صورتیں تلاش کی جاسکیں اور ان کا صحیح تعیّن کیا جاسکے۔

انسانی جسم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اجزائے ترکیبی تین ہیں۔ یعنی انسان مجموعہ ہے تین عناصر کا۔

ایک　　جسمِ انسانی یعنی بدنِ انسانی

دوسرا　　نفسِ انسانی

تیسری　　رُوحِ انسانی

حیوان صرف دو چیزوں کا مجموعہ ہیں۔ ایک جسم اور دوسرا نفس۔ اور انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے، جسم، نفس اور رُوح کا انسانوں اور حیوانوں میں جو چیز انسان کو حیوان سے متمیّز کرتی ہے۔ وہ "رُوح" ہے۔ اس لئے ان عناصر کی نوعیت کا جاننا نہایت ضروری ہے اور جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ انسانی جسم کے ہر جزو کا مزاج کیا ہے اور وہ کس چیز سے بنا ہے تو اس

کے اطمینان کی صورتیں تلاش کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ کہ جو چیز جس شے سے بنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اُسی چیز سے اُسے اطمینان و سکون حاصل ہوگا۔

بدنِ انسانی

انسان کے جسم یعنی بدن کو اللہ تعالیٰ نے چکنی مٹی کے گارا سے تیار کیا تھا، قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر اس بات کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ دنیا کے اوّلین انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کے پتلا کو اللہ تعالےٰ نے کھنکھناتی ہوئی چکنی مٹی کے گارا سے تیار کیا تھا اور پھر اس پتلا میں اپنی طرف سے "روح" پھونک کر اپنی کمال قدرت سے اس کو گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان بنا دیا تھا اور اس کو بہترین ضروری صلاحیتوں سے آراستہ فرما دیا تھا۔ پھر اس انسان کو تخلیق کے بعد مٹی کی بنی ہوئی اس سرزمین پر آباد فرما دیا تھا اور اس کی جسمانی ضروریات کو بھی اسی زمین سے پیدا کرنے کا انتظام فرمایا۔ گویا بدنِ انسانی مٹی کا بنا ہوا ہے اور اس کو بدن بھی اسی مٹی سے پیدا ہونے والی چیزوں سے ملتا ہے — اور آج کل کے اس مادی دور میں انسان دن رات اسی مادی جسم کے سکون کے لئے بھاگ دوڑ کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے بدن کو مطمئن کرنے کے لئے اچھی سے اچھی غذائیں پلاؤ، قورمہ، متنجن، گوشت، سبزیاں، مٹھائیاں، کیک، پیسٹری، پھل اور میوہ جات کی تلاش میں رہتا ہے۔ اپنی شہوانی تسکین کے لئے اپنی ہم جنس حسین عورتوں سے سکون حاصل کرتا ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے مر مٹتا ہے۔ انسان کو یہ سب نعمتیں اسی زمین یعنی مٹی سے حاصل ہوتی ہیں۔

ہمارا بدن اور اس کے مختلف اعضاء جب اپنی ضروریات کے لئے پھڑپھڑاتے ہیں، یعنی ہمیں بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے۔ سردی اور گرمی

کا احساس ہوتا ہے۔ جس چیز کا بھی ہمارا یہ جسم مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اُسے ہم مہیّا کر دیتے ہیں، تو ہمارا جسم اطمینان محسوس کرتا ہے۔ جب بھوک مٹانے کے لئے ہمیں حسبِ ضرورت غذا مِل جاتی ہے، پیاس بجھانے کے لئے پانی مِل جاتا ہے، جسم کو گرمی و سردی کی حالت میں مناسب لباس مِل جاتا ہے۔ رہائش کے لئے مکان مِل جاتا ہے تو ہمارا جسم مطمئن ہو جاتا ہے، پھر ذرا اس بات پر غور کریں کہ بھوک کی حالت میں جب انسان کو حسبِ ضرورت غذا میسر آگئی ہو اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہو تو اس کے سامنے کیسی ہی بہترین خوراک رکھ دی جائے وہ اُسے استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی بھوک کا تقاضا پورا ہو چکا ہے۔ اور اس کا پیٹ مطمئن ہے کیوں کہ انسان صرف بدنِ انسانی کا نام نہیں ہے، اس لئے وہ ان بنیادی ضروریات کے پورا ہو جانے کے بعد بھی غیر مطمئن رہتا ہے۔

نفسِ انسانی

انسان کے جسم کا دوسرا جزو انسان کا نفس ہے۔ اور یہ نفسِ انسانی۔ گوناگوں جذبات اور خواہشات سے مرکب ہے اور یہ بھی انسان کے مادی جسم کو اس کے فطری جذبات اور خواہشات کی تکمیل کے لئے اکساتا رہتا ہے۔ یہ نفس بھی مادی چیز ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے انسانی جسم کی ضروریات کی تکمیل کے لئے نفس کی سرشت میں کچھ ضروری خواہشات اور جذبات رکھ دیئے ہیں تاکہ انسان اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنی خودی کی حفاظت کر سکے۔

نفسِ انسانی کی خواہشات اور جذبات کے اندر "شرافت" کا مادہ بھی ہے اور "شرارت" کا مادہ بھی ہے۔ جب نفسِ انسانی پھڑ پھڑاتا ہے اور اس کے اندر

خواہشات اور جذبات ابھرتے ہیں۔ مثلاً غصّہ کی حالت میں لڑنا جھگڑنا، اپنے دوسرے بھائیوں کی عداوت میں چغلی کھانا، غیبت کرنا، نفرت و دشمنی کرنا، ان کے مال و اسباب کو نقصان پہنچانا، چوری کرنا، فریب دینا، لوٹ مار کرنا، بدخواہی، بداخلاقی، چڑچڑاپن، رشوت، حسد، بخیلی و تنگ دلی وغیرہ قسم کی رذیل خواہشات پیدا ہوتی ہیں، جو کہ دراصل ایک شریر نفس کی غذا ہیں اور جب یہ غذا اس کو مل جاتی ہے تو یہ نفس اینٹھ جاتا ہے اور اطمینان محسوس کرتا ہے، مگر یہ اطمینان بھی اس کا جھوٹا اطمینان ہوتا ہے اور اس کا ضمیر اس کو ہرگز گوارا نہیں کرتا مگر وہ اپنے ضمیر کی آوازوں کو دبا کر غلط کام کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے نفس امّارہ (شریر نفس) اپنے جھوٹے اطمینان کے باوجود بے اطمینانی محسوس کرتا ہے اور اس کے دل میں ایک خلشِ موجود رہتی ہے۔

آج کل جس طرح ہم اپنے جسم کو مطمئن کرنے کے لیئے، مٹی کھا رہے ہیں مٹی پہن رہے ہیں، مٹی میں رہ رہے ہیں اور مٹی ہی ہماری سواری اور اوڑھنا بچھونا ہے، اسی طرح ہم اپنے نفس کے جھوٹے تقاضوں کو پورا کرنے میں سرگرداں ہیں اور ہر انسان اپنے سفلی اور حیوانی جذبات کی تکمیل و تسکین کے لیئے دن رات دوڑا پھرتا ہے اور نفس کو مطمئن کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ تو کیا ہمارا نفس مطمئن ہے؟ ہرگز نہیں، اور ہم اپنے جسم اور نفس کے سارے تقاضے پورے کرنے کے باوجود "اطمینانِ قلب" سے کوسوں دور ہیں۔

اس نفسِ انسانی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ صفات کے لحاظ سے اس کی تین بڑی قسمیں ہیں، ان تینوں قسموں کے حالات کا جائزہ اور سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں نفس انسانی کی تین حالتوں کا ذکر کیا ہے۔

نفسِ امّارہ یہ وہ نفس ہے جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے اور اسے قرآنی اصطلاح میں "نفس امّارہ" کہتے ہیں۔

نفسِ لوّامہ دوسرا وہ نفس ہے جو غلط کام کرنے، غلط سوچنے یا بری نیت کرنے پر پشیمان ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام "نفسِ لوامہ" ہے اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔

نفسِ مطمئنہ تیسرا وہ نفس ہے، جو انسان کو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ کرتا ہے اور اسی میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔

نفسِ امّارہ

قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں، ان میں مصر کے بادشاہ "عزیزِ مصر" کی بیوی زلیخا کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام پر برائی کے لئے ڈورے ڈالنے اور بالآخر انہیں برائی پر مجبور کرنے کے لئے اپنے محل کے دروازے بند کر لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے اس برائی کے خلاف جو مزاحمت کی گئی تھی، اس کا ذکر قرآن پاک میں یوں کیا گیا ہے۔

"قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ"

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا "خدا کی پناہ۔ میرے رب نے تو مجھے کو عزت

سے نکلوا کر بادشاہ کے گھرانے میں پہنچا دیا اور اس طرح مجھے اچھی منزلت بخشی اور میں (برائی کا) یہ کام کروں، ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔"

اور آخر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے نفسِ امّارہ کے متعلق فرمایا:۔

"وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط"

"میں کچھ اپنے نفس کی برارت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو انسان کو برائی پر اکساتا ہی ہے۔ الّا یہ کہ کسی پر میرا رب ہی رحم کرے اور اُسے بدی سے بچنے کی توفیق دے دے۔"

اس طرح گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے نفسِ امّارہ کی تشریح فرمادی کہ انسان کا نفس جب بے لگام ہو تو وہ اسے بدی پر ہی اکساتا رہتا ہے۔

نفسِ لوّامہ

نفسِ لوامہ جس کا دوسرا نام انسانی ضمیر ہے اور کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں ہے جس کے اندر ضمیر موجود نہ ہو۔ ہر انسان کے ضمیر میں قدرت نے نیکی اور بدی، بھلائی و برائی خیر اور شر کی ایک خاص تمیز پیدا کر دی ہے اور کوئی انسان چاہے کتنا ہی بگڑا ہوا کیوں نہ ہو، اس کا ضمیر اُسے برائی اور گناہ کے کاموں پر ضرور ٹوکتا رہتا ہے۔ مگر جب کوئی انسان اپنے اس ضمیر کی آواز کو دبا کر مسلسل غلط کام کرنے لگتا ہے تو اس کے دل پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے اور اُسے نیکی پر ابھارنے والی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔

ہر انسان کا صاف ضمیر گناہ کے کاموں پر ندامت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہتا ہے اور اس کے دل میں گناہ کے خلاف ایک خلش چھوڑ جاتا ہے جو اسے بے چین رکھتی ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے۔ بلکہ ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر نیکی و بدی اور بھلائی و برائی کی تمیز پیدا کر دی ہے۔

نفسِ مُطمئنہ

صفات کے لحاظ سے انسان کے نفس کی تیسری قسم نفسِ مطمئنہ کی ہے اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جو کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور حاکم و الٰہ مان لے اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان لے، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اُسے ملے، اُسے سراسر حق جانے جس کام سے بھی اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے منع فرمایا ہو، اس سے بادلِ ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین و ایمان کے ساتھ رُک جائے کہ فی الواقعہ وہ بُرا کام ہے جس ایثار و قربانی کی بھی راہِ حق میں ضرورت پیش آئے، اُسے اللہ کے راستہ میں پیش کر دے، جن مشکلات و مصائب اور تکالیف کا سامنا ہو، انہیں پورے سکون و اطمینان کے ساتھ برداشت کرے۔ غلط اور باطل راستوں پر چلنے والوں کو دنیا کے جو فوائد اور منافع اور لذتیں حاصل ہو رہی ہیں، اُن سے محروم رہ جانے پر اس کے دل میں کوئی حسرت پیدا نہ ہو، بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن

رہے کہ دینِ حق کی پیروی نے اسے ہر طرح کے خساروں سے دراصل محفوظ و مامون کر دیا ہے۔

اسی نفس کو بشارت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے "اے نفسِ مطمئنہ" چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اپنے نیک انجام سے خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے، شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔" (پارہ ۳۰ سورہ الفجر)

رُوحِ انسانی

انسان جن عناصر سے مرکب ہے اُن میں سے تیسری چیز روح ہے۔ یہ رُوح ایک جسم لطیف رکھتا ہے جس طرح فرشتے اور جنات ایسا لطیف جسم لطیف رکھتے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتا، اسی طرح اس روح کے جسم لطیف کو بھی ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ اس روح کو انسانی بدن میں ایک امتیازی مقام اور حیثیت حاصل ہے۔

روح کی عظمت

○ اسی روح کی بدولت انسان کو جنات اور فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہو گئی ہے اور یہ روح ہی ایک ایسی قیمتی چیز ہے کہ جب تک یہ انسانی بدن میں نہیں پھونکی گئی تھی، انسان محض مٹی کا ایک بے جان جسد تھا، اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے اور جب بھی یہ روح بدن سے الگ ہو جاتی ہے، تو پھر انسان کا بدن ایک بے حس و حرکت لاش کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

یہی روح جب انسانی جسد میں پھونکی گئی تھی، تو اس نے انسان کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر فرشتوں کا مسجود بنا دیا اور زمین پر اسے خدا کے خلیفہ یعنی

نائب خدا کی حیثیت دے دی۔
قرآن پاک میں انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ کہ انسان کی تخلیق کے موقعے پر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا "میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے بشر پیدا کرنے والا ہوں، پس جب میں اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں اور اس میں زندگی کی روح پھونک دوں، اس کے بعد تم اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا تب سارے فرشتوں نے اکٹھے سجدے کیا۔ سوائے شیطان ابلیس کے۔"
اسی طرح اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کے موقع پر "جب تیرے رب نے ملائکہ سے فرمایا، میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔" وہ بولے "کیا آپ اس زمین میں اپنا نائب بنائیں گے جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے اور ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی تقدیس بیان کرتے ہیں، حق تعالےٰ نے فرمایا، یقیناً میں خوب جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
(سورہ بقرہ ۴۔ اعراف ۲۔ بنی اسرائیل ۷۔ کہف ۷۔ طٰہٰ، صٓ)
اس طرح گویا فرشتوں نے اپنی تسبیح و تقدیس کی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کا دعوےٰ کیا، تو اللہ تعالےٰ نے ان کے اس دعوےٰ کو رد فرمایا اور ان کا امتحان لے کر ثابت کر دیا کہ ہم نے اپنے آدم کو تم سے زیادہ علم بخشا ہے اور جب ابلیس نے بھی اپنے مادۂ تخلیق (آگ) کو بنائے فضیلت قرار دے کر آدم کی بزرگی تسلیم کرنے اور اس کے آگے سربسجود ہونے سے انکار کیا تو اُسے بھی ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا۔
فرشتے ایک نوری مخلوق تھی اور جنات آگ کے جوہر سے پیدا کئے جانے

کی وجہ سے ایک ناری مخلوق تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے پیدا کر کے، اس کے اندر روح پھونک کر اور اُسے کائنات میں ضروری حد تک تصرف کرنے کی صلاحیتیں اور علم دے کر فرشتوں اور جنات پر فضیلت دے دی

رُوح کیا ھے؟

اس روح کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں" (اے نبی) اور آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے۔ " اَلرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" یعنی روح میرے رب کے امر میں سے ایک چیز ہے اور تمہیں اس کی کیفیت کے متعلق بہت کم علم دیا گیا ہے۔ (پارہ ۱۷ آیت ۸۵)

اللہ تعالےٰ نے انسانی قالب کے اندر روح پھونک کر اسے اپنی صفات کے ہلکے سے پرتو سے فیضیاب فرما دیا۔ جس کی بدولت اسے تمام مخلوقات پر ایک روحانی بلندی نصیب ہو گئی۔

روح کی خصوصیات

رُوح کی حقیقت

جہاں تک انسانی جسم کے پہلے دو عناصر یعنی جسم و نفس کا معاملہ ہے۔ ان کی تخلیق کا تعلق اللہ تعالیٰ کے "عالم خلق" یعنی مخلوقات میں سے ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی جیسے مادہ سے پیدا کیا ہے مگر انسانی جسم کے تیسرے عنصر " یعنی روح" کی پیدائش کا تعلق اللہ تعالےٰ کے عالم امر سے ہے۔

• عالم خلق میں ہر کام اسباب کے ذریعے سر انجام پاتا ہے۔ مگر " عالم امر "

اسباب ظاہری کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے عالمِ امر میں کام بغیر ظاہری اسباب و عوامل کے ہو جاتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "روح عالمِ خلق کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق "عالمِ امر" سے ہے، یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس کا تعلق "عالمِ امر" سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جب اس کائنات کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے امر یعنی حکم سے ایک ایسا مادہ پیدا فرمادیا جس سے اس کی مختلف چیزیں بنائی جانے والی تھیں۔ پھر اس مادہ سے اپنی قدرت خلق کے ذریعہ کائنات کی مختلف چیزیں زمین، آسمان، سورج چاند، ستارے، ہوا پانی اور زمین و آسمان کی دیگر مخلوقات کو پیدا فرمادیا اور ان سب چیزوں کا تعلق "عالمِ خلق" سے ہے۔ عالمِ امر کے قوانین ہی جدا ہیں۔ اسے عالمِ خلق یعنی اسباب کی دنیا پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بقول پیرانِ پیر حضرت سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ "عالمِ خلق" اسباب کا گھر ہے۔ یہاں پر ہر کام ظاہری اسباب کے ذریعے سرانجام پاتا ہے۔ اس کے برعکس "عالمِ امر" قدرتِ خداوندی کا گھر ہے جو اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس عالمِ امر کے تحت اللہ تعالیٰ کے محض حکم (کُن فیکون) سے سرانجام پانے والے کاموں کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی کے پُتلے میں جب اللہ تعالیٰ نے اپنے امر سے "روح" پھونکی تو اُسے گوشت پوست کے انسان میں تبدیل کر دیا اور اسے اشرف المخلوقات بھی بنا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود بادشاہ کی بھڑکائی ہوئی آگ کو

(یا نارُ کونی برداً وسلٰماً علیٰ ابراھیم) کے حکم کے ذریعہ ٹھنڈا کر کے ان کے لئے گل وگلزار میں تبدیل کر دیا اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کے نیچے سے آب زم زم کا وہ چشمہ جاری کر دیا۔ جو چار ہزار سال سے مسلسل ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور حاجی صاحبان اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ وسلامت رکھا۔

حضرت موسےٰ علیہ السلام کی لاٹھی اژدہا کی شکل اختیار کر کے جادوگروں کے تمام سانپوں کو ہڑپ کر گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسی عصا نے بہتے ہوئے دریا میں ان کے لئے خشک راستے بنا دیئے۔ مگر اُسی راستہ نے فرعون اور اس کے لشکروں کو اپنے پانی میں غرق کر دیا۔

معراج کی رات کو اللہ تعالیٰ نے پل بھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں اور جنّت کی سیر کرا دی۔

آپ کی انگلی کے اشارہ نے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔

روح کی پہلی خصوصیت

انسانی روح کی تخلیق کا تعلق بھی چونکہ اللہ تعالےٰ کے عالم امر سے ہے اس لئے ہر روح کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فطری طور پر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قُرب کی تلاش میں سکون محسوس کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت

روح کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس کائنات میں نورِ ہدایت ہیں۔ اسی طرح انسان کے جسم کی اس چھوٹی سی کائنات میں یہ "روح" نورِ ہدایت ہے جو انسان کو حیوانی پستیوں سے نکال کر اخلاقی بلندیوں کی طرف لے جانے کے لئے مسلسل کوشاں رہتی ہے۔

"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"

"نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ"

یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ"

"اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو روشن کرنے والے ہیں"

"وہ سراپا نور ہیں"

"اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں نورِ ہدایت دیتے ہیں"

تیسری خصوصیت

روح کی تیسری خصوصیت اس کا علم ہے۔ اس علم الاشیار کی بدولت ہی انسان کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہو گئی تھی اور جب اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر فرشتوں سے دنیا کی مختلف چیزوں کے نام دریافت کئے تھے تو انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا مگر انسان نے خدا تعالےٰ کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر مختلف اشیار کے نام بتا دیئے تھے اور اسی علم کے دائرے میں آفاق و انفس کے علوم بھی آ گئے جس کی بدولت انسان جہالت اور نادانی کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی میں آ گیا۔

چوتھی خصوصیت

روح کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ہر روح اپنا ایک الگ "جسمِ لطیف" رکھتی ہے جس کی وجہ سے اس کی انفرادیت اور الگ تشخص قائم رہتا ہے، ہر ایک کے اپنے تجربات اور دائرہ ہائے عمل ہوتے ہیں، جن کا حصہ دار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے، جیسے ہر شخص کا غم اپنا غم ہوتا ہے، دوسرے کا غم نہیں ہوتا ہے، دوسرے اس سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں۔ یا اپنے اسی نوعیت کے غموں کو یاد کر کے اُس کے غموں کا احساس و اندازہ تو کر سکتا ہے مگر جس داخلی کیفیت سے وہ گذر رہا ہوتا ہے اُس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہو سکتا ہے۔ ہر انسان کی یہی انفرادیت اُسے اپنی شخصیت کی تعمیر پر مجبور کرتی رہتی ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ صیقل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور یہ انفرادیت پسندی ہر شخص کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی رہتی ہے۔

پانچویں خصوصیت

رُوح کی پانچویں خصوصیت اُس کی "غیرت" ہے ہر انسانی روح بڑی غیور واقع ہوئی ہے اور اس کی خودی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہر ایک کے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھ دے یا ہر ایک کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے اور ہر ایک کے سامنے گریہ وزاری کرتی پھرے۔

ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ ہر انسان کے اندر فطری طور پر آزادیٔ فکر و عمل کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور وہ اپنی اس آزادی میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں کرتا ہے۔ پھر اس میں قدرتی طور پر حسین و جمیل چیزوں کے ساتھ محبت کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کی حامل "روح" رکھنے والا انسان صرف اُسی ہستی کے سامنے اپنے آپ کو جھکائے گا یا سجدہ ریز ہوگا جو ہستی اس کائنات کی تمام چیزوں پر غلبہ اور فوقیت رکھتی ہوگی، تمام صفاتِ حسنہ کی مالک ہوگی، انسان کی کمزوریوں، خامیوں اور احتیاجات سے واقف ہوگی، انسان کے ساتھ گہری ہمدردی بھی رکھتی ہوگی، اور اس کی ترقّی کے خواہاں بھی ہوگی اس کا علم بھی کامل ہوگا، اور قدرت بھی کامل ہوگی۔ اور ایسی ہستی صرف خدا کی ہستی ہی ہو سکتی ہے۔

ہمیں انسانی جسم کے ان عناصرِ ترکیبی کی بحث ذرا تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کرنا پڑی ہے کہ ہمیں اپنے جسم کے عناصرِ ترکیبی کے مزاج و مقام سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو جائے اور ہر ہر عنصر کے مقام اور مزاج کے مطابق اس کے اطمینان کے سامان تلاش کئے جاسکیں۔

قلب کا مقام

انسانی جسم کے عناصرِ ترکیبی کی تشریح کے بعد قلب یعنی دل کے مقام کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

بظاہر تو دل ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ مگر انسان کے جسم کی زندگی کو قائم رکھنے میں اس کو بہت ہی اہم مقام حاصل ہے۔ جب تک انسان کا دل حرکت کرتا رہتا ہے اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر سرانجام دیتا رہتا ہے۔ انسان زندہ رہتا ہے اور جب دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے تو انسان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

دل کے لغوی معنی۔ مغز۔ اور خلاصہ کے ہیں مگر عام اصطلاح میں دل کا لفظ نفس اور روحِ حقیقی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور دل کا دماغ کے ساتھ بھی نہایت گہرا تعلق قائم رہتا ہے۔

دل کے اندر جذبات بھی ہوتے ہیں اور سوچنے کا مادہ بھی ہوتا ہے اور ان جذبات اور سوچ کے معاملات میں بھی دل کا دماغ کے ساتھ فوری تعلق قائم رہتا ہے ۔ اس طرح یہ دل بھی اپنے مادی وجود کے علاوہ ایک انسانی لطیفہ (لطیف چیز) بھی ہے، جو خواہشات بھی رکھتا ہے اور جذبات بھی رکھتا ہے اور اپنی خواہشات اور جذبات کی تکمیل دماغ اور جسم کے ذریعے کرا لینے پر پوری قدرت بھی رکھتا ہے۔

دِل کی امتیازی خصوصیات

انسانی بدن میں دِل کو کچھ اور بھی امتیازی خصوصیات حاصل ہیں، پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے، کہ انسان کے جسم اور نفس کا تعلق "عالم خلق" سے ہے اور روح اور روح کے لطائف کا تعلق "عالم امر" سے ہے اور دل کا مقام "عالمِ خلق" اور "عالمِ امر" دونوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کا ہے اور یہی اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس لئے دل ایک طرف "عالمِ خلق" سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق "عالمِ امر" یعنی روح کے ساتھ بھی رہتا ہے۔

چنانچہ قرآن کی اصطلاح (زبان) میں دل کا مقام یہ قرار پاتا ہے کہ دل سے مراد وہ ذہن یعنی (MIND) ہے جو انسان کے حواس خمسہ یعنی آنکھ، کان، ناک، قوّتِ لامسہ (چھونے کی قوّت) اور قوّتِ ذائقہ (چکھنے کی قوت) وغیرہ کے ذریعہ

سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل یعنی ــــــ (Action) کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے اور اس راستہ پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس طرح "رُوح" گویا ایک چراغ ہے اور قلب شیشے کی قندیل ہے، جس کے اندر یہ چراغ روشن ہے اور انسان کا جسم وہ طاقچہ ہے جس کے اندر یہ قندیل لٹک رہی ہے۔ اس لحاظ سے دل کو نہایت اہم مرکزی حیثیت حاصل ہے اور چونکہ دل کا تعلق بیک وقت انسان کے جسم کے ساتھ، انسان کی رُوح کے ساتھ اور انسان کے دماغ کے ساتھ قائم رہتا ہے ۔ اس لئے انسان کے ذہنی اطمینان اور سکون کا تعلق بھی قلب یعنی دِل کے ساتھ ہے جسے ہم "اطمینانِ قلب" کا نام دیتے ہیں۔

———— ٭ ————

دلِ مردہ، دِل نہیں ہے، اُسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
(علامہ اقبالؒ)

دنیا کی حقیقت اور اس میں انسان کا اعلیٰ مقام

انسان اپنی موجودہ زندگی جس کائنات میں بسر کر رہا ہے، اس کائنات کے بعض حقائق پر بھی اگر غور کر لیا جائے اور اس کائنات کے خالق کی صفات پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے تو یہ باتیں بھی انسان کے "اطمینانِ قلب" کی مختلف صورتوں کے تعین میں ممد ہو سکتی ہیں اور اس طرح انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ خود انسان کی اور اس کائنات کی مشترک قدریں کونسی ہیں۔

کائنات کا حُسن و جمال

اللہ تعالیٰ جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کائنات میں انسان کو بسا دیا ہے، وہ خود سراپا نور ہے۔ اور نہایت حسین و جمیل ہے، حسن و جمال کو پسند کرتا ہے اور اس کی پیدا کردہ ہر چیز جمادات، نباتات، حیوانات اور چرند و پرند بلکہ کیڑے مکوڑے تک نہایت حسین و جمیل ہیں اور اس کے حُسن و جمال کا مظہر ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو حسن و جمال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ "اَللّٰہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ" کہ اللہ تعالیٰ خود بھی حسین و جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

دیدارِ الٰہی کی اعلیٰ شان بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جنت میں نبیوں

شہیدوں، صدیقین اور صالحین کو جب اللہ تعالیٰ خصوصی انعام کے طور پر اپنے دیدار سے شرف یاب فرمائیں گے، تو جنتی لوگ اس "دیدارِ الٰہی" کے مقابلے میں جنت کی باقی تمام نعمتوں کو بھول جائیں گے اور ان کی نگاہوں میں دیدارِ الٰہی سے بڑھ کر دنیا اور جنت کی کوئی دوسری نعمت بار نہ پا سکے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حسن کی مناسبت سے دنیا کی ہر چیز کو نہایت حسین اور خوبصورت پیدا فرمادیا ہے۔ جمادات میں رنگا رنگ کے خوبصورت اور چمکدار پتھر اور ہیرے جواہرات پیدا فرما دے، باغات کو رنگا رنگ پھلوں، پھولوں اور پتّوں و تنوں سے سجا دیا، پرندوں، چرندوں اور حیوانات کو خوبصورت لباسوں سے آراستہ فرمادیا۔

کائنات میں فرشتوں جیسی نوری مخلوق موجود تھی، جو اطاعت شعار اور وفادار بھی تھی، جنات جیسی ناری مخلوق بھی موجود تھی مگر اللہ تعالےٰ نے ایک تیسری مخلوق۔ انسان۔ کو پیدا فرمادیا، جس کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"

ہم نے انسان کو ہر لحاظ سے بہترین ساخت پر پیدا فرمایا اور اس کو وہ تمام صلاحیتیں عطا فرمائیں، جن کی مدد سے وہ آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اور آج انہی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر انسان چاند پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے اور زہرہ، عطارد، زحل، مشتری جیسے ستاروں کی طرف دوڑ لگا رہا ہے۔

یہ کائنات بھی نہایت حسین ہے۔

اس کائنات کا نظام حکمتوں پر مبنی ہے،

یہ کائنات بامقصد ہے، بے مقصد نہیں ہے
یہ کائنات نفع بخش ہے اور منافع سے بھرپور ہے۔ کیونکہ حکمت، مقصدیت اور افادیت، حسن کے خواص ہیں۔

کائنات کی مقصدیت کے تقاضے

اس کائنات کی ہر چیز حسین تھی کھیتوں اور باغات میں حسن تھا، پھلوں اور پھولوں میں حسن تھا۔ درختوں میں تنوع اور حسن تھا، آسمانوں میں جگمگاتے تاروں اور چاند اور سورج کی قندیلیں روشن تھیں، دریاؤں اور سمندروں کی روانی میں حسن تھا، سمندروں کی تہوں اور پہاڑوں کی گہرائیوں میں ہیرے موتی، جواہرات اور معدنیات بکھری پڑی تھیں، پھولوں اور پھلوں میں رنگینی تھی۔ گویا یہ کائنات اپنی تمام رنگینیوں، لطافتوں اور حکمتوں کے ساتھ موجود تھی، مگر اس سے لطف اٹھانے والی مخلوق نہ تھی۔ کوئی اس کی حکمتوں کو سمجھنے والا نہ تھا، کوئی اس کی اشیاء کے ناموں تک جاننے والا نہ تھا، کوئی پیدائش کائنات کے مقصد کی تکمیل کرنے والا نہ تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی آرٹسٹ اور صنّاع کے فن اور کاریگری کو سمجھنے والا نہ ہو، سراہنے والا نہ ہو، داد دینے والا نہ ہو تو وہ آرٹ اور فن لاحاصل ہو جاتا ہے، موتی اور پتھر برابر ہیں۔ اگر کوئی موتیوں کا پرکھنے والا نہ ہو، ہیروں اور موتیوں میں کوئی فرق کرنے والا نہ ہو، تو ہیروں کے بنانے کا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ جن پھولوں کی رنگ و بو سے کوئی لطف اندوز ہونے والا نہ ہو، وہ پھول کس کام کے؟ نغموں اور فطرت کی سریلی آوازوں سے لطف اندوز ہونے کا ذوق کسی میں نہ ہوتا تو بلبل کی شیریں آواز اور کوّے کی کائیں کائیں میں کیا فرق تھا۔

کائنات کے ان مظاہر کی بنا پر، کائنات کا خالق یہ چاہتا تھا کہ اس کی تخلیق کے مقصد کو کوئی سمجھے، اس سے لطف اندوز ہو، اس کی داد دے، اُسے اپنے کام میں لائے، اور پھر اس کائنات میں غور و فکر کی صلاحیتیں اسے اپنے خالق کی معرفت تک پہنچائیں، وہ خالق کے رازوں کا رازدان بن جائے اور رازدان بن کر اس کا قدردان بھی بنے، وہ خود اپنے آپ سے اور اس کائنات کے خالق سے محبت بھی کرے، اس کی محبت کا حق بھی ادا کرے اور یہ محبت اُسے اپنے خالق کی اطاعت کی طرف لے جائے اور پھر وہ اس اطاعت کا حق ادا کر کے جنت کے مزید انعامات کا مستحق قرار پائے۔ مگر یہ سارے کام وہ اپنی آزاد مرضی، اپنے آزاد اختیارات اور خود اپنی خوشی اور رضا سے کرے، اُسے کسی لحاظ سے اس پر مجبور نہ کر دیا جائے بلکہ اس کے سامنے صرف صراطِ مستقیم اور ٹیڑھے راستوں کا فرق واضح کر دیا جائے اور پھر وہ چاہے تو اپنے خالق اور اس کائنات کے خالق کو جان پہچان کر اور مان کر (ایمان لاکر) اس کے شکر یہ کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو ناشکری یعنی کفر کا رویہ اختیار کرے۔

کائنات کا بارِ امانت

ان مقاصد کے پیشِ نظر اللہ تعالےٰ نے اس کائنات کی بارِ امانت کا بوجھ اپنی مخلوقات کی مختلف انواع کے سامنے رکھا، مگر کسی نے بھی اس بارِ امانت کو اٹھانے پر آمادگی ظاہر نہ کی اور دراصل ان کے اندر اس کی صلاحیتیں بھی موجود نہ تھیں مگر انسان نے کائنات کے اس بارِ امانت کو اُٹھا لیا، کیوں کہ اُس کے اندر اس کی صلاحیتیں موجود تھیں، اور اسی ذمہ داری کی بنا پر اُسے زمین میں خدا کا خلیفہ یعنی نائب قرار دے دیا گیا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر،
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

مقامِ بندگی اور چیز ہے اور مقامِ عاشقی اور چیز ہے، فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے صرف سجدہ ریزی چاہی تھی، مگر انسان سے بندگی و اطاعت، عبادت و فرمانبرداری کا مطالبہ تھا۔ حق تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون لوگ حق تعالیٰ کو دیکھے بغیر محض اپنی پیدائش اور کائنات میں غور و فکر کرنے سے یا خدا کے سچے پیغمبروں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے بن دیکھے خدا کی ہستی کو تسلیم کر لیتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی محبت میں اپنے مال، جان اور اولاد تک کو قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ حتّٰی کہ خوشی خوشی کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے جامِ شہادت تک نوش کر جاتے ہیں۔ "اطمینانِ قلب" کے حصول کے لئے کائنات کی ان حقیقتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری تھا، اس لئے ان کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

تمام مخلوقات پر انسان کی برتری

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات میں سے انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی صلاحیتوں علم و عقل، فہم و شعور، تدبر، حکمت و دانش اور تخلیقی عناصر کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے زمین پر "نائب خدا" قرار دیا جائے اور خلافتِ ارضی اس کے سپرد کی جائے۔ کیوں کہ انسان کے سوا یہ ہمہ پہلو صلاحیتیں کسی بھی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی ان امتیازی خصوصیات کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس کائنات

میں اپنے اعلیٰ وارفع مقام کو پہچان کر سنجیدگی سے اپنی زندگی کا راستہ متعین کرے۔

کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات ایک عظیم الشان بلڈنگ اور عالی شان محل کی حیثیت سے تیار فرمائی ہے، جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم ہیں۔ اس کائنات کی ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ ضروریات سے یہ لبریز مکان کسی ضرورت مند مکین کے لئے بنایا گیا ہے جس کو اس میں بسانا مقصود ہے اور اس میں کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو اِن سامانوں کا حاجت مند بھی ہو، اس میں ان سامانوں کے استعمال کی صلاحیت بھی ہو تاکہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت بھی ہو، کیوں کہ مکان مکین کے بغیر ویران وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو آباد کرنے اور آباد رہنے کے لئے اس میں ایسی ذی شعور اور حساس مخلوق بسا دی ہے جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہے اور یہ مخلوق چار قسم کی ہے

حیوانات

ایک حیوانات ہیں جن کی سینکڑوں قسمیں ہیں، گھوڑے، گدھے، گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، طوطے، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ، بچھو، چرند پرند، کیڑے مکوڑے، درندے، مچھلیاں، مگرمچھ وغیرہ ہیں۔

غذا اور رہن سہن کے لئے اس کائنات میں ان کے بھی کچھ حقوق ہیں

حق کو پامال کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ اسلامی شریعت جس طرح انسانی حقوق کی حفاظت کرتی ہے اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت ملحوظ رکھتی

جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنا، ان کو بھوکا رکھنا، پرندوں کے گھونسلوں اور انڈے بچوں کو بلا وجہ برباد کرنا، کیڑے مکوڑوں کے گھروں میں پیشاب کر کے ان کو پریشان کرنا اور پاؤں تلے روندنا جائز نہیں ہے، جانوروں کا دل دکھانا اور ان کو ستانا بھی جائز نہیں قرار دیا، اسی لئے ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا اور تڑپانا جائز نہیں ہے تاکہ اپنے بھائی کی حالت سے اس کا دل نہ دکھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ شریف سے باہر تشریف لے گئے ایک دیہاتی کے ہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی، جو آپ کو دیکھ کر چلائی کہ یا رسولؐ اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیجئے کہ میں انہیں دودھ پلا آؤں، آپؐ نے فرمایا تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی؟ عرض کیا یا رسولؐ اللہ! سچا وعدہ کرتی ہوں۔ آپؐ نے اسے کھول دیا اور وہ وعدے کے مطابق اپنے بچوں کو دودھ پلا کر فوراً واپس آگئی۔ آپؐ نے اس کے گلے میں وہی رسی ڈال دی اور اسے بدستور باندھ دیا اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اس نے کھول دیا اور وہ اچھلتی کودتی اور حضورؐ کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جا ملی۔

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی

جانور کی رعایت تو اس کے کھول دینے سے فرمائی تاکہ ہرنی کے مامتا کے جذبہ کی رعایت ہو اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اس کا دل نہ دُکھے، بچوں کی رعایت اُن کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں۔ انسانی حقوق کی یہ رعایت ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس آنے پر دوبارہ باندھ دیا تاکہ واضح ہو کہ ایک انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے اور ساتھ ہی ایفائے عہد کی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک پر وفائے عہد لازم ہے تو عقلمند انسان پر کیوں لازم نہ ہوگا اور واضح کر دیا کہ جب وفائے عہد کا ثمرہ جانور کے حق میں نجات ہے کہ ہرنی کو آزادی مل گئی تو انسان کے لئے دنیا و آخرت میں نجات کیوں نہ ہو گی۔

جنّات

دوسرے جنّات ہیں، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے، مگر آثار و شواہد سے سمجھ میں آتے ہیں اور یہ بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جنّات میں ہر قسم کے افراد ہیں۔ نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں، مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی ہیں، مشرک بھی ہیں اور کافر بھی ہیں، یہودی بھی ہیں اور نصرانی بھی ہیں یہ جنگلوں اور ویرانوں میں بھی رہتے ہیں اور شہروں میں بھی رہتے ہیں۔ غذا اور رہائش کے متعلق ان کے بھی حقوق ہیں۔ ہڈیاں اور کوئلہ ان کی غذا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے۔ کیوں کہ یہ تمہارے جنّات بھائیوں کی خوراک ہے۔ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنّات کو پُر گوشت ملتی ہیں۔ اسی طرح مکانات سے بھی بلاوجہ ان کو اجاڑنا

جائز نہیں ہے۔ جب تک وہ کوئی تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔ جو شریر اور
غیر محتاط انسان اُن کی غذا یا رہائش گاہوں میں پیشاب کر کے اُن کو گندا کرتے
ہیں تو جنات بھی ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان کے آسیب کا اثر ہو جاتا ہے۔
قرآن حکیم کے مطابق "جن" وہ مخلوق ہے جو با ارادہ اور باشعور ہے جو
اپنے طبعی تقاضوں کی وجہ سے انسان کے حواسِ خمسہ سے پوشیدہ ہے۔ یہ
مخلوق بھی انسان کی طرح مکلّف، مطیع، عاصی، مشرک اور مومن ہو سکتی ہے
امام راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات قرآن" میں لکھتے ہیں کہ جن کے
حقیقی معنی کسی چیز کو پوشیدہ کرنے کے ہیں۔ دیوانے کو مجنون اسی لئے کہا جاتا
ہے کہ اس کی عقل اور سوجھ چھپ جاتی ہے۔ جن کو بھی اسی لئے جن کہا جاتا ہے
کہ وہ حواسِ بشری سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ موجودہ فلاسفر اور سائنس دان
اور علوم طبیعات کے ماہرین بھی اس نظریہ کا اظہار کرتے ہیں کہ زمین کے علاوہ
دوسرے سیاروں کی دنیاؤں میں انسانوں سے ملتے جلتے کروڑوں ذی عقل موجودات
کے وجود کا امکان پایا جاتا ہے اور ان دنیاؤں کی مخلوق ممکن ہے "مادہ" کی بجائے
"ضدِ مادہ" سے تشکیل ہوئی ہو اور غالباً وہ "ضدِ مادہ" سے بنے ہوئے ان سیاروں
کے گرد گردش کرتے ہوں۔ ضدِ مادہ کی دنیا اگرچہ مفروضات پر قائم ہے لیکن
ضدِ مادہ کی دریافت جو کولمبیا یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ اس عملی مفروضے کی تائید
کرتی ہے۔ یہ "ضدِ مادہ" ڈیوٹریم (DUTRIUM) کا مخالف جوہر ہے۔ سائنس
دانوں نے ۱۹۵۵ء سے اب تک "ضدِ مادہ" کے اجزا کو ایٹم شکن آلات کے
ذریعہ سے دریافت کیا ہے۔ "ضدِ مادہ" کا فرضی وجود ابتداً میں انگلستان کے نوبل
انعام یافتہ "پال رابرگ" نے ۱۹۲۷ء میں بیان کیا کہ مادہ کے ہر جزو کے مقابلے

ؔ سائنس دانوں کی "ضدِ مادہ" کی یہ اصطلاح نوری اور ناری مخلوق جو کہ نظر نہیں آتی اور روحوں پر بھی منطبق کی جا سکتی ہے۔

میں "ضدِ مادہ" کا ایک جزو بھی موجود ہے۔ سائنس دانوں کے اس بین الاقوامی گروہ نے "ضدِ مادہ" کو اس جوہر میں پایا ہے جو ضدِ پروٹون (PROTON) اور ضدِ نیوٹرون (NUTRON) سے تشکیل پاتا ہے۔ فطری طور پر تمام اشیاء کی بنیاد ہمیشہ ہی پروٹون اور نیوٹرون پر ہوتی ہے۔ اسی بناء پر جہاں "ضدِ مادہ" کے تصور پر جو کہ خاص قسم کے ثوابت اور سیاروں سے بنا ہے۔ شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان دنیاؤں میں ممکن ہے کہ انسان جیسی ذی شعور اور ذی عقل موجود ہو جو کہ ہمیں اپنے حواسِ خمسہ سے نظر نہ آتی ہو۔

"قرآنِ پاک" اس کائنات کے حقائق کے بیان میں انسان کے موجودہ سائنسی علوم سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ جب کہ انسانی علم اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ قرآنی حقائق کی طرف بڑھ رہا ہو۔ قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّات آگ سے خلق ہوئے ہیں۔

"بے شک ہم ہی نے انسان کو (خمیر شدہ) سڑی مٹی سے جو (سوکھ کر) کھنکھن بولنے لگے پیدا کیا اور ہم ہی نے "جنّات" کو آدمی سے پہلے بے دھوئیں کی تیز آگ سے پیدا کیا۔" (سورۂ الحجر آیت ۲۷)

قرآنِ حکیم کی سورۂ جن، سورۂ احقاف کی آیت ۲۹-۳۲ اور بعض دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم جنّات کے لئے بھی پیغمبر تھے۔

جنّات ہمیں دیکھتے ہیں لیکن ہم ان کو نہیں دیکھتے۔ خداوندِ عالم نے اولادِ آدمؑ کو شیطان کے فریب سے بچنے کی تاکید فرماتے ہوئے کہا۔

"وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔"

ہم نے شیطانوں کو اُن لوگوں کا دوست قرار دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"
(سورۃُ الاعراف آیت ۲۷)

سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنّات بھی انسانوں کی طرح اللہ تعالٰی کے سامنے ایک عاجز مخلوق ہے اور خلقت کے عمومی نظام کے تحت زندگی بسر کرتی ہے۔ اس آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔" اے جنّات اور انسانوں کے گروہ اگر تم آسمان اور زمین کی حدود سے باہر جا سکتے ہو تو نکل جاؤ مگر تم طاقت اور غلبے کے سوا نہیں نکل سکتے (رحمٰن آیت ۳۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنّات کی طاقت اور اختیارات بھی محدود ہیں اور یہ خداوندِ عالم کے عطا کردہ ہیں۔ اس طرح جنّات بھی باقاعدہ ایک جسم رکھنے والی مخلوق ہے۔

فرشتے (ملائکہ)

تیسرے فرشتے ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں اور نر و مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں۔ یہ ملائکہ بھی اس کائنات کے باشندے ہیں۔ کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں، کچھ زمین میں اور ان کے بھی حقوق ہیں۔ حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ چار انگل جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں پر ملائکہ نہ ہوں اور مشغولِ عبادت نہ ہوں۔ عالمِ بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالمِ سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں ہے۔ مساجد اور ذکرِ الٰہی و تعلیم دین کی محفلیں ملائکہ کے جمع ہونے کی جگہیں ہیں۔ ان جگہوں پر خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے تاکہ فرشتوں اور انسانوں کو راحت پہنچے، موالی

پیاز وغیرہ کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے، تاکہ انہیں اذیت نہ پہنچے حدیث شریف میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لیئے ملائکہ استغفار کرتے ہیں۔ جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہوں اور وضو نہ ٹوٹے۔ ایسا ہوتے ہی اُن کا استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس بدبو سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ ایسے بندوں سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ گویا ہم بدبو سے انہیں مکان سے اجاڑ دیتے ہیں جس کا ہمیں حق نہیں ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے فرشتے وہاں سے دُور چلے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا ہم جھوٹ بول کر بھی ان کا مکان چھین لیتے ہیں جس کا ہمیں حق نہیں ہے۔

فرشتوں کی غذا ذکرِ الٰہی، تسبیح و تقدیس اور اطاعتِ خداوندی ہے اور یہ کام فطری طور پر عین اُن کی طبیعت کے مطابق ہیں۔ اور جہاں پر بھی یہ کام ہو رہے ہوں اور جو مخلوق بھی یہ کام کر رہی ہو وہاں پر فرشتوں کے جھرمٹ جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ فرشتے بھی اپنا ایک جسمانی وجود رکھتے ہیں مگر اپنے جسم کی لطافت کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے۔ خدا کے پیغمبروں کے پاس یہ فرشتے اپنی اصلی شکل میں بھی اور انسانی لباس میں بھی آتے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان فرشتوں کو ان کے اصلی جسم میں بھی دیکھا ہے اور جب حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی اصل شکل میں خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے آتے تھے تو حضورؐ پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ آپ پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور آپ کی طبیعت وحی الٰہی کی وصولی کے

لیے پوری متوجہ ہو جاتی تھی اور یہ وحی الہٰی کہیں سفر کی حالت میں آپ پر آجاتی تو آپ کی سواری واونٹنی کے لئے آپ کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔

انسان

چوتھی قسم کی مخلوق انسانوں کی ہے جو اس زمین کے ہر خطے میں بسی ہوئی ہے اور اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔

یہی چار قسم کی مخلوقات ہیں جو اپنی اپنی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق اپنے اندر احساس وشعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ یا عالیشان محل کے جائز وارث ہیں۔ اور اس زمین و آسمان پر ان سب کے حقوق ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے حقوق کو پامال کرے یا ان کو تباہ وبرباد کرے البتہ انسان کو باقی سب مخلوقات پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

انسان کی بالادستی

حیوانات پر

حیوانات بھی اگرچہ ایک باشعور مخلوق ہے مگر یہ قوت گویائی سے محروم ہے اور انہیں عقل وفہم بھی واجبی سا دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی غذا، رہنے کی جگہ اور اپنی دوسری ضروریات کو سمجھ سکے اور مہیا کر سکے۔ وہ صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس اُن میں اپنی نوع کے اجتماعی مفاد کو سمجھنے کی کوئی اہلیت نہیں ہے اور نہ انہیں ایسے عقل وفہم کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ جن مقاصد کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے یہ عقل وفہم اُن کے مقاصد کی تکمیل میں حارج ہوتی۔

حیوانات کو دراصل انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان حیوانات کی اُون سے گرم کپڑے، پٹو اور کمبل وغیرہ تیار کر سکے۔ ان کی کھالوں سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ اُن کے گوشت کو استعمال کرے، اُن پر سواری کرے، اُن پر اپنے بوجھ لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے۔ گھوڑوں اور دوسرے جانوروں پر سوار ہو کر اپنے ٹھاٹھ باٹھ، رونق اور کرّوفر کا مظاہرہ کرے۔ اگر جانوروں کو اُن کی طبعی ضرورت سے زیادہ عقل و فہم دے دی جاتی تو جب انسان ان پر سوار ہونے لگتا ہے یا زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقلمند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے، پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر بوجھ لادنے، سواری کرنے یا باندھنے کا کوئی حق ہے، اس بحث میں اُلجھ کر سواری کرنا یا بوجھ لادنا تو ایک طرف رہ جاتا ہے اگر کہیں بحث میں کوئی جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے بلکہ یہ بھی ممکن ہو جاتا کہ وہی جانور آپ پر سواری کرتا اور ہمارے سارے کام کاج رک جاتے۔ اسی طرح اگر کہیں عقلمند جانور اپنے علم کو بڑھانے کے لئے آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی آگھستے، تو ایک ہی کلاس روم میں گھوڑے گدھے اور کتے سب جمع ہو جاتے اور جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ اور گیدڑ بھی آجاتے تو آپ کے لئے علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا۔ اس لئے اللہ کا شکر بجا لایئے کہ اس نے انہیں اتنا عقل و فہم نہیں دے دیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح عقل ایک نعمت ہے اسی طرح بے عقلی بھی ایک نعمت ہے۔ حیوانات کی بے عقلی سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ انسانوں میں سے جو انسان بے عقل اور بے وقوف اور کم علم ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں جن سے لیڈروں، پیشواؤں اور بادشاہوں کی حکمرانی چل رہی ہے

یہ بے وقوف انسان نہ ہوتے تو غلط قسم کے لیڈروں کی لیڈری نہ چمکتی اور بادشاہوں کو تابعدار رعایا نہ ملتی۔

اسی لئے جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق تھے اُن میں عقل کی ضرورت نہ تھی جس کی وجہ سے اُن کو بے سمجھ رکھا گیا تاکہ وہ انسان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ اُن کے لئے صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے۔ جس سے وہ کام پر لگے رہتے ہیں اور دن رات مشغول و منہمک رہتے ہیں اور انسان کو ہر حیثیت سے ان پر بالاتری حاصل ہے۔

جنّات پر

جنّات کی مخلوق بھی ذی شعور مخلوق ہے مگر انسان کو ان پر بھی بالادستی اور برتری حاصل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی پیدائش کی ابتدا کی اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تو جنّات کو بھی اور فرشتوں کو بھی اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ فرشتوں نے تو حکمِ الٰہی کی حکمت و مصلحت سمجھنے کے لئے کچھ سوال و جواب کرنے کے بعد انسان کے سامنے سجدہ کردیا۔ کیونکہ فرشتوں میں اطاعت خداوندی کا جذبہ غالب تھا۔ مگر جنّات کے سردار ابلیس نے اپنے تکبّر، بدفہمی اور بدعملی کی بناء پر انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اللہ کا نافرمان قرار پایا۔ جس پر اللہ تعالےٰ نے بھی اسے لعنت کا مستحق قرار دے کر ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ قرار دے دیا۔ اُس نے اللہ تعالےٰ سے انسانوں کو گمراہ کرنے کا اختیار مانگا مگر اُسے یہ اختیار نہ دیا گیا کہ وہ انسانوں کو زبردستی پکڑ کر بدی کے راستہ پر ڈال دے بلکہ اُسے صرف یہ اجازت دی گئی کہ وہ انسان کی سفلی خواہشات اور حیوانی جذبات کے ذریعہ اُن کے دل میں بُرے وسوسے ڈال سکے تاکہ وہ خدا کی فرمانبرداری کے راستہ سے بھٹک جائیں

مگر ان وساوس شیطانی کو قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار بھی انسانوں کے ہاتھوں میں رکھا گیا تاکہ وہ اپنے نفس کی پاکیزگی اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر وساوس شیطانی کا مقابلہ کر سکیں۔

شیطان نے خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے اور تکبر کی بنا پر انسان کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ جنات میں شر کا جذبہ غالب ہو چکا ہے اور وہ اطاعت خداوندی میں مخلص نہیں رہے ہیں اس لئے جنات اگرچہ وحی الٰہی کے مخاطب ہیں اور شریعت الٰہی کی پابندی کے مکلف ہیں مگر ان کی نوع میں سے پھر کسی کو نہ نبی بنایا گیا اور نہ اُن سے براہ راست خطاب کیا گیا بلکہ ان سے خطاب بھی بہ واسطۂ انسان ہی کیا گیا یعنی خود ان کی نوع پر براہ راست کوئی شریعت نہیں اتاری گئی اور نہ براہ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی، بلکہ انسان کے واسطہ سے ہی انہیں انسانوں کی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور ان کو دین کے معاملہ میں انسانوں کے تابع رکھا گیا گویا اُن میں شر کے غلبہ کی وجہ سے ان کی نوع کو نبوت کے شرف سے بھی محروم کر دیا گیا ہے، چنانچہ ان میں جو یہودی ہیں وہ حضرت موسےٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ تورات جنات پر نہیں اُتری یہ جو نصاریٰ ہیں وہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے متبع ہیں۔ انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اتری اور جو مسلمان ہیں وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع بنائے گئے ہیں خود قرآن پاک براہ راست ان پر نہیں اتارا گیا۔ پس جو شریعت انسانوں کے لئے آئی وہی اُن کے لئے بھی آئی مگر بواسطۂ انسان انہیں پابند شریعت کیا گیا۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں۔ نیک بھی ہیں اور بد

بھی ہیں، مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی ہیں، مشرک بھی ہیں اور یہودی، نصرانی بھی ہیں، چنانچہ قرآن کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے۔

حضورؐ کی بعثت سے قبل جنّات آسمانوں کے دروازوں تک آجا سکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگوؤں سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اُچک لاتے تھے جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملاکر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کرکے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے مگر حضورؐ کی بعثت کے بعد ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بھی بند کر دیا گیا، تو وہ سخت پریشان ہوئے، ان کو تلاش ہوئی کہ وہ کونسی نئی بات ظہور میں آئی ہے، چنانچہ اُن کی ایک جماعت کا گذر مکّہ شریف میں ہوا تو دیکھا کہ حضور قرآن پاک پڑھ رہے ہیں۔ وہ قرآن سُن کر ایمان لے آئے اور اپنے بھائیوں کو جاکر اس بات کی اطلاع دی۔ آج بھی بیت اللہ شریف کے قریب ایک شاہراہ پر اسی مقام پر مسجد جنّ تعمیر شدہ موجود ہے۔ جس کی حاجی صاحبان زیارت کرتے ہیں۔

فرشتوں پر

ملائکہ یعنی فرشتے اللہ تعالےٰ کے مقرّب اور مقدس بندے ہیں (بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ) وہ اللہ تعالےٰ کے مطیع و فرمانبردار بندے ہیں جن سے گناہ یا معصیت کا صدور ممکن نہیں ہے (لَا يَعْصُوْنَ اَمْرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ) اس لئے ان کی توہین کفر ہے اور اُن پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہاں پر انسان کی طبعی خصوصیات اور علم و عمل کا جو موازنہ فرشتوں کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ یہ صرف بیان حال کے طور پر ہے۔ اس کا مطلب ملائکہ کی شان کو کم کرنا نہیں ہے (العیاذُ باللہ)

علم میں انسان کی برتری

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں اس کائنات میں انسان کو اپنا خلیفہ اور نائب بنانا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے عرض کی کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں ہی کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنے والا اور کون ہے؟ اس پر حق تعالےٰ نے اوّل تو حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا اور ملائکہ کو چیلنج کیا کہ تم ذرا کائنات کی اشیاء کے نام تو بتاؤ؟ فرشتے نہ بتلا سکے تو آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم بتاؤ، اُس نے تمام نام بتا دیئے۔ اس طرح فرشتوں پر واضح ہو گیا کہ علم کا ابتدائی مرحلہ علم اسماء ہے، جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لے جا سکے تو اسماء اشیاء کے بعد صفاتِ اشیاء، خواصِ اشیاء اور حقائقِ اشیاء وغیرہ کے علوم میں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے۔ اس طرح فرشتوں پر یہ بات ثابت کر دی گئی کہ علمی میدان میں انسان کی برتری ملائکہ پر "کمیت علم" یعنی مقدارِ علم کے لحاظ سے بھی ہے (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا) جو ملائکہ کو نہیں ملی اور "کیفیت علم" کے لحاظ سے بھی ہے۔ کیوں کہ ملائکہ کا علم محدود قسم کا ہے جس میں پھیلاؤ نہیں اور انسان کا علم تدبّر اور تفکر لئے ہوتا ہے۔ جس میں پھیلاؤ اور ترقی ہوتی ہے۔ یعنی فرشتہ کو اگر چار مسئلے معلوم ہوں تو وہ چار کے چار ہی رہیں گے اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ اپنے تدبر اور اجتہاد کے ذریعہ ان چار میں دس بیس اور مسائل ملا کر نئے نئے علوم دریافت کر لیتا ہے۔ انسان کے علم کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ انسان علم حاصل کرنے کے لئے محنت و مشقت

کر کے علم کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جاتا ہے۔

اسی لئے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا (سُبحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا)

اسی علم کی بدولت آئمہ کرام اور فقہائے عظام قرآن پاک کی ایک ایک آیت اور حدیث پاک کے ایک ایک فقرہ سے کئی کئی مسائل اخذ کر لیتے تھے اور علم و حکمت کے دریا بہا دیتے تھے۔ اپنے اسی علم کی طاقت سے سائنس دان اور کیمیا دان جب اس کائنات کے مختلف عناصر میں جوڑ توڑ کرتے ہیں تو نئی نئی ایجادات بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر صنعت اور عمل کے میدان میں نئی نئی ایجادات کرنا نہ فرشتوں سے ممکن تھا اور نہ جنات وحیوانات سے انسان نے ہی ایک سے ایک محیر العقول ایجادات کر کے دنیاوی وسائل اور رونق میں اضافہ کیا ہے، نہ کسی جن نے آج تک کوئی ایجاد کی جس سے دنیا میں سجاوٹ پیدا ہوتی، جنات وشیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے۔ اسی نوعیت کا آج بھی کرتے ہیں۔ ان کے مکر و فریب میں کوئی جدت نہیں پیدا ہوئی، نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا جس سے نیکی وعبادت کا کوئی نیا طریقہ نکال لیتے، نہ کسی جانور نے آج تک کوئی نیا راستہ نکالا، یہ چوپائے کھانے پینے، چرنے اور نسل بڑھانے کے کام جیسے پہلے کرتے تھے وہ آج بھی کرتے ہیں۔

ایمان بالغیب میں برتری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک

دفعہ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا اَیُّھُمْ اَعْجَبُ اِیْمَاناً؟ بتلاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت تو وہ تجلیاتِ ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت دوزخ اُن کے سامنے ہے۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضورؐ نے فرمایا انبیاء ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو اُن پر ملائکہ اُترتے ہیں۔ اللہ کی وحی اُن پر آتی ہے جلال و جمالِ خداوندی اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، معجزات اُن کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں، وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہوگا، حضورؐ نے فرمایا تمہیں کیا ہوا، جو تم ایمان نہ لاؤ! پیغمبرؐ تمہارے سامنے ہے، معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو، وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟ تو پھر صحابہ نے عرض کیا کہ (اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ) خدائے تعالےٰ اور اس کے رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے، تب حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب اُن لوگوں کا ہے۔

جو تمہارے بعد آئیں گے

نہ پیغمبر ان کے سامنے ہوں گے

نہ معجزات ان کے مشاہدہ میں آئیں گے

اور اوپر سے شکوک و شبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے

مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر ثابت قدم رہیں گے تو اُن کا ایمان عجیب ہو گا۔

عبادات میں افضلیت

اسی طرح ملائکہ اگر عبادات میں مصروف رہتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ نہ اُن کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت اور غصّہ کا قصّہ، اسی لئے انسان کا ایک سجدہ فرشتہ کی ہزار سال کی عبادت سے زیادہ عجیب بلکہ افضل ہے، کیوں کہ وہ نفسانی خواہشات کی مخالفت پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں کے مطابق وہ صبح کے وقت گرم بستر میں سے اُٹھ کر سردی میں پانی سے وضو کر کے، اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگ جاتا ہے۔ اس کا نفس اُسے آمادہ کرتا ہے کہ نرم نرم بستر سے نہ اُٹھے، ہاتھ پاؤں کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے، سرد ہوا میں سکڑتا ہوا مسجد کی طرف نہ جائے۔ لیکن وہ دن بھر کی کاروباری مصروفیات کو چھوڑ چھاڑ نماز کی ادائیگی کے لئے پانچوں وقت خدا کے گھر کو آباد کرتا ہے۔ یہ انسان اپنے خدا کو خوش کرنے کے لئے ہی نفس کُشی اور جہادِ نفس کرتا ہے مگر فرشتوں میں نہ نفس امارہ ہے اور نہ ہوائے نفس، کہ وہ ان کا مقابلہ کریں۔ عبادت اُن کے لئے ایک طبعی تقاضا ہے۔

بِرّ و تقویٰ میں برتری

عبادت کی دو قسمیں ہیں ایک افعالِ خیر یعنی نیکی اور بھلائی کے کام جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کا تعلق انسان کی معاشرت، معیشت، معاملات اور خانگی زندگی سے ہے۔ عبادت کی یہ قسم بھی فرشتوں سے متعلق نہیں ہے کیونکہ اُن میں

نسل کا قصہ ہی نہیں ہے کہ اُن کے رشتہ دار پیدا ہوں اور لین دین کے معاملات صلح و جنگ اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے۔

عبادت کی دوسری قسم کو تقوےٰ کہتے ہیں جس کے ذریعہ گناہ سے بچا جاتا ہے، یہ بھی انسان کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ تقوےٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا بس میں ہو اور ملائکہ میں شر کا مادہ ہی نہیں وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے، انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے، اس لئے یہ شر سے بچنا بھی اُس کے لئے عبادت بن جاتا ہے جسے تقوےٰ یعنی پرہیزگاری کہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو اپنے ایمان کی بدولت اللہ تعالےٰ سے جو محبت پیدا ہوتی ہے اور قرب الٰہی کی جو کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں وہ بھی عجیب وغریب ہوتی ہیں۔

ایک حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے عرض کی کہ ہمارے ایمان اور دل کی جو کیفیت آپ کی مجلس میں ہوتی ہے وہ اس وقت قائم نہیں رہتی جب ہم آپ کی مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر وہ کیفیت تم پر ہر وقت طاری رہے تو راستوں میں فرشتے آآ کر تم سے مصافحہ کریں۔

تخلیقی عناصر کی بدولت انسان کی برتری

یہ کائنات جس میں ہم آباد ہیں اس کی تخلیق میں بھی چاروں عناصر استعمال ہوئے ہیں اور انسان کی تخلیق بھی ان چار عناصر سے کی گئی ہے۔ اس کائنات میں یہ ایک فطری اصول کارفرما ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں استعمال ہونے والے چاروں عناصر آگ، ہوا، پانی اور مٹی جب تک اکیلے اور الگ

الگ رہتے ہیں تو یہ علم و عمل یا صنعت و کاریگری کے میدان میں کوئی ترقی
کر سکتے اور نہ ہی کوئی نئی چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ کسی نئی چیز کا دنیا میں اُسی وقت
اضافہ کر سکتے ہیں جب ان میں دو متضاد عناصر کو باہم متصادم کر دیا جائے جب
ان کو باہم ٹکرا دیا جاتا ہے تو مادی ترقی کے میدان میں نئی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔
مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں، جس طرح آج سے ہزاروں برس پہلے وہ جلتی
اور بھڑکتی تھی اسی انداز میں آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے یہ نہیں ہوا ہے کہ ہزار
یا دس ہزار سال کے بعد اس نے اپنے رنگ یا لپٹ میں کوئی تبدیلی کر لی ہو۔ اسی
طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں، سمندر اور دریا آج سے کئی ہزار برس پہلے جس
طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اُچھلتے کودتے تھے اور نشیب کی طرف بہتے تھے اسی
طرح آج بھی کر رہے ہیں۔ ہوائیں بھی جیسے پہلے چلا کرتی تھیں آج بھی چل رہی ہیں۔
زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاکی تھی، اب بھی ہے۔ اس میں بطور خود کوئی ترقی اور
ارتقا نہیں ہے۔ لیکن جب ان میں سے کسی ایک عنصر کو دوسرے عنصر سے ٹکرا
دیا جائے تو وہیں ترقی شروع ہو جاتی ہے اور توانائی کی نئی نئی قوتیں ظاہر ہو جاتی
ہیں۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اوپر سے ڈھانپ کر نیچے آگ جلا دی جائے جس
سے یہ آگ پانی پر حملہ آور ہو جائے اور پانی آگ پر یعنی وہ اُسے ٹھنڈا کر دینا چاہے
اور یہ اُسے گرما دینا چاہے تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جاتی
ہے جسے بھاپ (Steam) کہتے ہیں اس سے ہمارے انجن اور مشین چلنے لگتی
ہیں اور مادی اور تمدنی ترقی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر آگ کو پانی سے ٹکرا نہ دی جائے
تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ اسی طرح جب آگ ہوا
سے ٹکراتی ہے تو آسمان کے بادلوں میں گرج، چمک، کڑک اور بجلی پیدا ہو جاتی ہے

شہابِ ثاقب پیدا ہوتے ہیں جن سے فضا میں عجائبات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب مٹی اور پانی کو ملایا جاتا ہے تو اس کا گارا بن جاتا ہے جس سے اینٹیں اور مکانات تعمیر ہونے لگتے ہیں۔ نئے نئے ڈیزائن کے برتن اور دوسرے سامان تیار ہونے لگتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ نے انسان کے جسم کے پتلے کو مٹی کے گارے سے تیار کر کے جب اس میں آگ اور ہوا کو بھی استعمال کیا اور اس میں رُوح پھونکی تو یہ گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ جس کے لئے اس کائنات میں غور و فکر کی صلاحیتیں پیدا فرما کر علم و عمل کی نئی راہیں بھی کھول دیں اور اسے عقل و فہم کی قوتوں سے بھی مالا مال کر دیا جن کی بدولت یہ انسان ہر زمانہ میں نئی نئی ایجادات سے دنیا کو مزین کر تا رہا ہے اور ترقی کرتے کرتے آج ریل گاڑیاں، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، موٹر گاڑیاں اور راکٹ اور مصنوعی سیارے بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے جن کی بدولت چاند اور دوسرے سیاروں پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے۔ تار برقی ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعہ اپنے پیغامات کہاں سے کہاں تک پہنچا رہا ہے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ گھر گھر دنیا بھر کی خبریں اور نقشے تک پہنچا رہا ہے۔ صنعت و حرفت، تجارت اور سیاست کے میدانوں میں ترقی کرتے کرتے کہاں پہنچ گیا ہے۔

یہ کام جنات نہ کر سکتے تھے کیوں کہ اُن کی تخلیق محض آگ سے ہوئی تھی اور نہ فرشتے کر سکتے تھے کہ ان کا علم محدود قسم کا تھا اور نہ حیوانات کر سکتے تھے کہ اُن میں علم و عقل کی کمی تھی۔

گویا انسان کے سوا اس کائنات کی تینوں باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے، جنات میں شیطنت کا غلبہ ہے

اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ نے اس انسان میں یہ ساری قوتیں جمع فرمادی ہیں۔ اس میں ملکیت بھی ہے، بہیمیت بھی ہے اور شیطنت بھی ہے۔

انسان کے اندر کی ان تینوں باہم متضاد کیفیات کو اعتدال میں رکھنے اور ان میں توازن پیدا کرنے کے لئے ربانی ہدایت اور وحیِ الٰہی کی ضرورت تھی جس کا اللہ تعالےٰ نے اوّل روز سے ہی اہتمام فرمادیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو شریعتِ الٰہی سے بھی باخبر کر دیا۔

انسان کی اصل برتری وحی الٰہی سے حاصل شدہ علمِ شریعت کی پابندی اختیار کرنے کی بنا پر ہے

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا تینوں باشعور مخلوقات پر انسان کو اگر افضلیت اور برتری حاصل ہے تو وہ محض عقل وشعور کی بناء پر نہیں ہے اور نہ محض اُس علم کی بدولت ہے جو اشیا کے ناموں، اُن کے خواص اور اُن میں تفقہ و اجتہاد کے ذریعہ نئی نئی ایجادات کر لینے سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ علم و عقل اور فہم و شعور تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے عطا فرمایا تھا کہ وہ اس کائنات کی چیزوں سے اچھی طرح استفادہ کر سکے اور ان میں تصرف کر سکے۔ اور اس طرح کا علم دوسری مخلوقات کو بھی حسبِ ضرورت حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کی آسائشوں کو بھی حاصل کرتی رہتی ہیں اور اپنے فرائضِ منصبی بحسن انجام دیتی رہتی ہیں۔

آپ اگر اپنی سائنس کی مدد سے آج ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے آپ کو فضا میں پرواز کرتا نظر آتا ہے۔ آپ مختلف معدنیات سے تیار کردہ ہوائی جہازوں کے مصنوعی پروں کے ذریعہ اڑتے ہیں اور چیل کوے وغیرہ اپنے قدرتی پروں اور خلقی قوت سے اڑتے ہیں۔ آپ نے سوتی، اونی، ریشمی اور نائلون کے لباس تیار کر لیے ہیں تو ہر چرند، پرند بھی رنگارنگ کی ڈیزائن دار کھال اور پروں سے مزین ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے اور اُن کا قدرتی، آپ اپنی رہائش کے لئے مکانات کوٹھیاں، بنگلے اور محل بناتے ہیں۔ پرندے اور جانور بھی حسب ضرورت بہترین گھونسلے اور رہائش گاہ تعمیر کر لیتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی چڑیا (بیا) اپنے لئے عجیب وغریب قسم کا گھونسلا تیار کرتی ہے۔ جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں، ماں باپ کا الگ اور بچوں کا الگ یہاں تک کہ اس میں بچوں کے لئے جھولا بھی ہوتا ہے جس میں اُس کے بچے جھولتے ہیں یہ گھونسلا درخت میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن مضبوط اتنا کہ آندھی آئے، طوفان آئے۔ مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

شہد کی مکھیاں اپنا چھتہ بناتی ہیں، اس کے ہشت پہلو سوراخ اس قدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پرکار کی مدد سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں، جو نہ بارش میں خراب ہوتا ہے اور نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے۔

سانپ اپنی رہائش گاہ مٹی سے بناتا ہے جو اُوپر سے بُرجیوں دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اس کے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ

بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں۔

پھر یہ پرندے اور جانور اپنے گھونسلوں اور مکانات کی تعمیر کے لئے انجینئرنگ کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے رہن سہن میں تنظیم و سیاست اور نظم و ضبط کا بھی شاندار مظاہرہ کرتے ہیں۔

شہد کی مکھیاں تک اپنی اجتماعی زندگی میں اپنی ملت کی سیاسی تنظیم قائم رکھتی ہیں یہ جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز میں اس کے مثبت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر اپنا یہ قلعہ تعمیر کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح کرتی ہیں کہ پہلے وہ اپنا ایک امیر منتخب کرتی ہیں جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے۔ ان کا یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں۔ اندرون قلعہ کی انتظامی تدبیر یہ کرتی ہیں کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا رہتا ہے اور ایک حصہ کے خانوں میں ان کے بچے پلتے رہتے ہیں۔ ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی مکھی سے قومی مفاد کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ امیر اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی پھوٹی پڑی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پھول یا پتے پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ چوس لاتی ہے۔ جس سے اس بنے ہوئے شہد میں اس زہر کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ یعسوب اُسے فوراً محسوس کر لیتا ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اُسے نیچے گرا دیتا ہے تاکہ وہ اس چھتہ کے اندر نہ گھسنے پائے اور نہ اس زہریلے

مادے سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع ہوں۔ اس قتلِ نفس پر بھی مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خوشدلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جھکا دی جاتی ہے۔

تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ شہد کی مکھیوں کے پالنے کا کاروبار کرتے ہیں اور وہ کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر یعنی "یعسوب" کو پکڑ کر جب اُس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں۔ چھتہ بناتی ہیں اور شہد تیار ہو جاتا ہے۔

یہی حالت بطخوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جب بطخیں سوتی ہیں تو ان کا امیر ان کی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے۔ وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے۔ جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز پر پرواز میں آجاتی ہیں اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اُڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اڑتی ہیں۔ جدھر امیر جاتا ہے اُدھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے۔ کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے۔ پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے تمام بطخیں وہیں اُتر پڑتی ہیں۔ اس طرح اُن میں بھی بہترین تنظیم و سیاست پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کی مختلف خصوصیات دوسری مخلوقات میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی برتری مطلق علم و عقل یا فراست کی بنا پر نہیں ہے کیونکہ مطلق علم تو دوسری مخلوقات کو حاصل ہے حتیٰ کہ جانور بھی

علم سے خالی نہیں ہیں۔ اس لئے مطلق علمی ترقی کوئی قابل فخر بات نہیں ہے اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور دوسری مخلوقات پر افضلیت نمایاں ہو سکتی ہے۔ جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم نہ حاصل ہو جو اس کے سوا دوسری مخلوقات کے پاس نہ ہو۔ کیوں کہ افضلیت تو کسی ایسی خصوصیت کی بناء پر ہی ہو سکتی ہے جو اس میں ہو اور دوسروں کے پاس نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں کو دیا گیا ہے اور اس کے سوا کسی اور مخلوق کو نہیں دیا گیا تو وہ علم ہے علم شریعت اور علم احکام خداوندی۔ جس سے انسان کو اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور یہ علم انسان کو صرف خدا کے سچے پیغمبروں کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ علم کسی بھی غیر انسان کو نہیں دیا گیا ہے اور نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے۔ نہ جنّات کو ہی براہ راست یہ علم دیا گیا ہے۔ بلکہ ان کو بھی اس علم کے حصول کے لئے انسانوں کے تابع رکھا گیا ہے اور نہ حیوانات ہی اس سے واقف ہیں۔

صرف یہی "علم شریعت" ہی انسان کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُسے سب مخلوقات پر فوقیت دے دی ہے۔ اور وہ اس کائنات میں خدا کا نائب اور خلیفہ قرار پایا ہے۔

محض علوم طبیعہ علوم خیالیہ اور علوم شیطانیہ انسان کی خصوصیت قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کیوں کہ یہ علوم تو صرف انسان کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

اگر انسان اپنے ان حیوانی تقاضوں کو ہی معراج و ترقی کا مدار سمجھنے لگے اور اپنے علم و عقل کو انہی کا تابعدار بنا دے، اپنی خواہشات و جذبات کو

احکام خداوندی کا تابع نہ بنائے تو وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان اور چرندہ و پرندہ تو بن سکتا ہے مگر انسانیت کے جوہر سے محروم رہتا ہے۔ بلکہ قرآن پاک کی اس آیت کا مصداق قرار پا جاتا ہے۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ"

کہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو بہترین ساخت پر پیدا فرمایا تھا مگر اس نے اپنے کو حیوانات سے نچلے درجے پر گرا دیا۔ اس لئے انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا راستہ اختیار کر کے صحیح معنوں میں خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر رہے۔

خُدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

انسانی زندگی کے اہم مسائل

انسان کے اجزائے ترکیبی، بدن، نفس، روح، قلب اور کائنات کی بحث میں انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارات مل چکے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ کچھ ایسے سوالات بھی ہیں، جو فطری طور پر ہر انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر کسی غفلت کی وجہ سے نہ پیدا ہوتے ہوں تو پیدا ہونے چاہئیں کہ انہی سوالات پر غور و فکر کرنے اور ان کے صحیح صحیح جوابات مل جانے سے ہی انسان کو "اطمینانِ قلب" کا حقیقی راز مل سکتا ہے، اس لئے ہم ان سوالات کے متعلق اور ان کے جوابات پر ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

زندگی کے حقائق

دنیا بھر میں آج انسانوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جس نے کبھی انسانی زندگی کے فطری سوالات کے متعلق سوچنے اور غور و فکر کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ہے۔ حالانکہ فطرتِ انسانی پکار پکار کر انسان کو ان مسائل کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے، کائنات کے ٹھوس حقائق قدم قدم پر ٹھوکریں لگا کر اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر انسان ہے کہ بلا سوچے سمجھے، عقل و فکر کو استعمال کئے بغیر زندگی کے دن پورے کئے جا رہا ہے جیسے وہ کوئی بے گار کاٹ رہا ہو یا حیوانات کی طرح محض چرنے چگنے اور اولاد پیدا کرنے کے لئے آیا ہو۔ عام لوگوں کو اکثر کسی

چیز کی فکر ہے تو محض حیوانی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کی فکر ہے۔ اُن کی ساری دوڑ دھوپ حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ اور ارفع مقام کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔ اس غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کی زندگی اپنے اصل محور سے بہت دُور چلی گئی ہے، جس کی وجہ سے اُسکے ذہن میں ہر دم بے اطمینانی کا ایک لاوا پکتا رہتا ہے، جس کو ٹھنڈا کرنے کی اُسے کوئی سبیل نظر نہیں آتی ہے۔

انسان اگر نہ سوچے تو اس کی مرضی، وہ اپنے عقل و خرد سے کام نہ لے تو اُسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا، مگر معمولی غور و فکر کرنے سے اس کے ذہن میں چند ضروری سوالات ضرور پیدا ہوتے ہیں

ذرا غور کیجئے!

کہ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو موجود پاتا ہے اور اس طرح موجود پاتا ہے کہ اُس کے پاس ایک جسم ہے، اس جسم میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں، اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان دنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں بے شمار چیزیں موجود ہیں اور وہ ان چیزوں سے کام لینے کی قدرت و صلاحیت اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس کے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور نباتات، جمادات اور چرند و پرند وغیرہ پائے جاتے ہیں جن کے ساتھ اس کی زندگی کا کچھ نہ کچھ تعلق موجود ہے۔

کائنات کا نظم و ضبط

پھر یہ عظیم الشان کائنات جو ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے، اس کا نظام ایک زبردست ڈسپلن اور

نظم کے تحت چل رہا ہے، یہ کروڑوں سیارے جو ہمیں گردش کرتے نظر آتے ہیں یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، یہ چاند جو رات کو چمکتا ہے اور اس سے ہم اپنے دن اور مہینے گنتے ہیں۔ یہ سورج جو دن میں پوری آب و تاب سے روشن رہتا ہے یہ زہرہ، یہ مریخ، یہ عطارد، یہ مشتری اور دوسرے بے شمار ستارے جو گیند کی طرح گھوم رہے ہیں، ان کی گردش میں کیسی باقاعدگی ہے، کبھی رات اپنے وقت سے پہلے نہیں آتی، کبھی دن رات سے پہلے دیر میں آتا نہیں دیکھا گیا ہے، کبھی چاند زمین سے نہیں ٹکرایا، کبھی سورج نے اپنا مقررہ راستہ نہیں چھوڑا، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطہ میں کسے ہوئے ہیں، زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے، ایک سیکنڈ کے لئے بھی اگر زمین اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ سارا کارخانہ بکھر جائے، ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے، روشنی اپنے قاعدے کی پابند ہے۔ مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، سٹیم، درختوں یا جانوروں کسی میں بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ اپنی حد سے بڑھ جائیں یا اپنی خاصیتوں کو بدل دیں۔

خود ہم انسانوں کو زندہ رکھنے کے لئے، زمین و آسمان کی تمام قوتیں متفقہ طور پر ہماری پرورش میں لگی ہوئی ہیں، اگر تنہا ایک ہوا ہی اس مشترکہ کام سے علیحدگی اختیار کر لے، تو ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں گی، اگر پانی، ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کر دے تو ہمیں بارش کا ایک قطرہ نصیب نہ ہو سکے، اگر مٹی پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے، ہمارے باغ سوکھ جائیں۔ ہماری کھیتیاں نہ پک سکیں۔ ہمارے مکان کبھی نہ بن سکیں، اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو، تو ہمارے چولھے ٹھنڈے

ہو جائیں، ہمارے سارے کارخانے یک لخت بند ہو جائیں، اگر لوہا آگ کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دے تو ہماری ریل گاڑیاں اور موٹریں تو درکنار معمولی سوئی اور چھری تک نہ بن سکے، غرض یہ ساری دنیا جس میں ہم جی رہے ہیں۔ یہ کچھ مقررہ ضابطوں کی پابندی کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

پھر ذرا اس پہلو پر بھی غور کیجئے کہ خدا کی وہ نعمتیں جن سے ہم دن رات فائدہ اٹھاتے ہیں، ہوا، پانی، سورج، چاند کی روشنی وغیرہ۔ ان کا ہمیں کوئی بل ادا نہیں کرنا پڑتا ہے، یہ بھی خدا کی رحمت ہے، جن چیزوں میں بھی انسانوں کا دخل ہو جاتا ہے، وہ پانی ہو، بجلی ہو، ہوا ہو، سوئی گیس ہو، ان کے ہمیں بل آنے شروع ہو جاتے ہیں، دریائے راوی پر کسی ادارہ نے لاہور میں ایک پل بنا دیا ہے۔ کئی سالوں سے اس پر سے گذرنے والی ہر سواری کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے اور معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ مگر ہم خدا کی نعمتوں کو بلا معاوضہ روزانہ استعمال کرتے ہیں اور ہمارے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس کی اِن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مسجد میں جا کر اس کے آگے سجدہ ریز ہی ہو جائیں اور نماز بھی پڑھ لیں۔

خدا کی ہستی

یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ کائنات کی ان سب چیزوں کو ضابطوں کا پابند کس نے بنا رکھا ہے؟ یہ ضابطے تجویز کرنے والا کون ہے؛ اور کس کے حکم کی وجہ سے یہ سب چیزیں ایک مضبوط نظام میں بندھی ہوئی ہیں؛ کیا ہمارا دل اس بات کی گواہی نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک بلند و بالاتر ہستی ہے، جسے ہم خدا (GOD) کے نام سے پکارتے ہیں وہی اکیلا خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ اور رب ہے، جس کی زبردست طاقت

نے اس کائنات کی سب چیزوں کو اپنے ضابطے میں باندھ رکھا ہے

خدا کی وحدانیت

پھر اگر اس کائنات کی تدبیر وانتظام کرنے والے ایک کی بجائے دو خدا بھی ہوتے، تو یہ انتظام اس باقاعدگی سے نہ چل سکتا، خدا کی وحدت یعنی توحید کی وجہ سے ہی اس کائنات کا نظام بڑی باقاعدگی اور عمدگی سے چل رہا ہے۔ گویا واقعہ صرف اتنا نہیں ہے کہ یہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو صرف ایک خدا نے ہی بنایا ہے، بلکہ وہی اکیلا اس پر حکمرانی بھی کر رہا ہے۔

پھر ایک سچی بات یہ بھی ہے کہ خدا کی اس خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی ہے، جن چیزوں کو اور جس مخلوق کو اس اکیلے خدا نے بغیر کسی کے تعاون اور امداد کے بنایا اور پیدا کیا ہو اور یہ چیزیں محض اپنے بل بوتے پر زندہ اور قائم بھی نہ رہ سکتی ہوں، ان میں سے کسی کی چاہے وہ چاند ہو، سورج ہو، ستارے ہوں، آگ، ہوا، سمندر، دریا، فرشتے اور جن وانسان ہی کیوں نہ ہوں، یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں ان کو حصہ دار قرار دے دیا جائے اور ان کے اندر حاجت روائی، مشکل کشائی، دادرسی تقسیم رزق اور دعاؤں کے سننے اور قبول کرنے کے اختیارات مان لئے جائیں۔ کیا کسی نوکر یا مزارع یا غلام کو ہم نے کبھی اپنی ملکیت یا جائداد میں شریک کیا ہے؟ کیا ہماری عقل یہ بات مانتی ہے کہ کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنا لے ان باتوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو خود ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ

خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو بھی بطور خود، خدا کے بندوں پر اپنا

حکم چلانے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی کو اس کا کوئی حق حاصل ہے۔

یہ خدا کے بندوں میں سے زندہ ہوں یا مردہ، جن لوگوں کو بھی ہم نے اپنی کم علمی اور نادانی کی وجہ سے مختلف حیلوں بہانوں اور جھوٹے دلائل کی بنا پر اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مان لیا ہے، ان کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے اور حق کے بھی سراسر خلاف ہے، اسے ہی مذہبی اصطلاح میں "شرک" کہتے ہیں اور یہ توحید کے سراسر خلاف ہے۔ یہ شرک دراصل خدا کی بغاوت ہے۔ اللہ تعالےٰ باقی سب گناہوں کو تو معاف کر دیں گے مگر شرک کو معاف نہیں کریں گے۔

ہماری پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں

خداوند تعالیٰ جو اس کائنات اور تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے، وہ کسی کے بنائے سے خداوندِ عالم نہیں بنا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ ہم اس کی خدائی مانیں تو وہ خدا ہو، اس کی خدائی خود اپنے زور پر قائم ہے، ہم سب انسانوں کی پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں ہیں۔ جب چاہے ہمیں پکڑ کر گھسیٹ لے زمین اور آسمانوں کی اس خدائی سلطنت میں سے بھاگ نکلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے کہ ہم کوئی جرم یا نافرمانی کر کے کسی قبائلی علاقہ میں چلے جائیں، ہم یہاں سے بھاگ کر کہیں اور پناہ نہیں لے سکتے ہیں۔

مرنے کے بعد بھی مٹی میں مل کر ہمارے جسم کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو جائے آگ میں جل کر ہماری راکھ ہوا میں پھیل جائے، پانی میں ڈوب کر ہم مچھلیوں کی

خوراک بن جائیں یا سمندر کے پانیوں میں گھل مل جائیں، ہر جگہ سے خدا ہمیں پکڑ سکتا ہے، ہوا اُس کی غلام ہے، زمین اس کی تابعدار ہے۔ پانی اور مچھلیاں سب اس کے حکم کے تابع ہیں، اس کے ایک اشارے پر سب طرف سے ہم پکڑے ہوئے آجائیں گے اور ہمارے جسم کے تمام ذرات پھر سے جمع ہو کر انسانی صورت اختیار کر لیں گے۔

پھر خدا ہم میں سے ایک ایک کو بُلا کر پُوچھے گا

میری رعیت، میرے بندے اور میرے غلام ہو کر دنیا میں اپنی بادشاہی کا اعلان کرنے اور دعوے کرنے کا حق تمہیں کہاں سے مِل گیا تھا؟

میرے ملک میں اپنا حکم چلانے کے اختیارات تم کہاں سے لائے تھے۔

میری سلطنت میں اپنا قانون جاری کرنے والے تم کون تھے؟

میرے بندے ہو کر دوسروں کی بندگی اور غلامی کرنے پر تم کیسے راضی ہو گئے؟

میرے نوکر اور غلام ہو کر تم نے دوسروں کا حکم کیوں مانا؟

مجھ سے تنخواہ اور رزق لے کر دوسروں کو "داتا" اور رازق کیوں سمجھتے رہے؟

میرے غلام ہو کر دوسروں کی غلامی کیوں کی؟

میری بادشاہی میں رہتے ہوئے تم نے دوسروں کے قانون کو کیوں قانون سمجھا اور دوسروں کے فرامین، آرڈیننسوں کی کیوں اطاعت کی؟

یہ میری بغاوت تمہارے لئے کیسے جائز ہو گئی تھی۔

اب فرمائیے

ہم میں سے کسی کے پاس ان الزامات کا کوئی جواب ہے ؛
ہمارا کوئی وکیل وہاں اپنے قانونی داؤ پیچ سے ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نکال سکے گا ؟

کیا کسی کی سفارش پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اس بغاوت کے جرم سے بچالے گا اور کیا کسی ملک کے باغیوں کو سفارش پر کبھی معاف کیا گیا ہے

چند فطری سوالات

غور و فکر کی ان راہوں سے ہوتے ہوئے اب ہم اپنی زندگی کے ان بنیادی سوالات تک آن پہنچے ہیں ، جن کے صحیح جوابات مل جانے سے ہی ہماری زندگی کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں ، یہ سوالات جو ہر انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ انسان کی حیثیت اس کائنات میں کیا ہے ؛

۲۔ یہ کائنات خود کیا ہے ؟

۳۔ انسان اور اس کائنات کا خالق کون ہے ؛

۴۔ خدا ، انسان ، کائنات کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے ؟

یہ سوالات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ جب تک ہم خود اپنے بارے میں ، دنیا کی ان چیزوں کے بارے میں اور ان کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلیں ، ان کے ساتھ کیسے معاملہ کر سکتے ہیں ؛

اِن سوالات کے جوابات کیسے حاصل کیئے جائیں

ان سوالات کو جان لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سوالات کے جوابات کیسے حاصل کئے جائیں۔؟

کیا انسانی عقل ان سوالات کے جوابات فراہم کر سکتی ہے؟

کیا سائنس دان اور فلاسفر ان سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں۔؟

جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ ان سوالات کے جوابات پیش کرنے سے عاجز ہے کیوں کہ انسانی عقل یہاں کی مادی چیزوں کو تو اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے مگر اپنی زندگی کیلئے کوئی ضابطہ عمل تجویز کرنے سے قاصر ہے کیونکہ انسان محض ایک مادی وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی مخلوق ہے اور بقول مشہور و معروف فلاسفر ([illegible])

"عالم ارواح کے متعلق غور کرنے سے انسانی عقل کے پَر جلتے ہیں۔ اس میدان میں قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر انسانی عقل نے جتنے دعوے بھی کیئے ہیں وہ محض دعوے ہی دعوے ہیں جن کی پُشت پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے مغربی مفکرین نے انسان کو محض حیوان سمجھ کر اس کی مادی ضروریات کی فراہمی اور اس کی حیوانی خواہشات کی تکمیل کے تو بہت اچھے اچھے سامان فراہم کر دیئے ہیں۔ اور مغربی معاشرہ میں حیوانیت اور بہیمیت کا ایسا غلبہ ہوا ہے کہ انسانی اقدار و اخلاق دم توڑ بیٹھے ہیں اور وہاں کے باشندے اطمینان قلب و سکونِ قلب سے محروم ہو گئے ہیں۔

یونانی فلاسفروں نے بھی اس میدان میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انسانیت کے قافلہ کو بھی صدیوں سے گمراہی کے راستوں

پر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

اگر انسانی عقل میں یہ صلاحیت موجود ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کے لئے کوئی صحیح ضابطۂ عمل تجویز کر سکتی تو آخر اللہ تعالےٰ کو یہ کیا پڑی تھی کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ہر زمانہ میں جگہ جگہ مختلف قوموں کی ہدایت کے لئے نبیوں کو مبعوث فرماتا رہتا اللہ تعالےٰ نے تو انسانوں کی اسی کمزوری کے پیش نظر جب دنیا میں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کو پیغمبر قرار دے کر ایک وحی کے ذریعے سے ان پر زندگی کا ضابطۂ عمل بھی نازل فرما دیا۔

اس لئے ان سوالات کے جوابات ہمیں اگر کہیں سے مل سکتے ہیں تو وہ خدا کے سچے پیغمبروں کے ہاں سے ہی مل سکتے ہیں اور ان سب پیغمبروں کی تعلیمات کا نچوڑ مستند صورت میں ہمیں قرآن پاک سے ہی مل سکتا ہے، جو خدا کی آخری سچی کتاب ہے اور قیامت تک تمام انسانوں کی راہنمائی کے لئے کافی ہے۔ اس لئے ہمیں ان سوالات کے صحیح جوابات قرآن پاک سے ہی حاصل کرنا پڑیں گے اور یہی جوابات صحیح اور برحق ہوں گے۔

قرآن پاک کے جوابات

ان سوالات کے جوابات کے سلسلہ میں قرآن پاک نے جو حقائق بیان فرمائے ہیں۔ اگر ان کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو سچے دل سے قبول بھی کر لیں، تو ہمارے لئے "اطمینانِ قلب" کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

انسان کی حیثیت

۱۔ خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق مالک اور فرمانروا ہے، اپنی وسیع مملکت کے اس حصے میں جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا، اُسے سوچنے سمجھنے اور جاننے کی قوتیں دیں، بھلائی اور برائی کی تمیز دی، ان میں انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی، کائنات کی چیزوں میں تصرف کرنے کے اختیارات دیئے اور فی الجملہ انسان کو ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ یعنی نائب (Viceroy) بنادیا۔

قرآنِ پاک ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان کو خلافت کے اس منصب پر فائز کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات بتادی

کہ تمہارا اور اس تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔

میری اس سلطنت میں نہ تم کہیں خود مختار ہو نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔

دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں یہ اختیارات دے کر بھیجا جارہا ہے۔ دراصل تمہارے لئے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمہارے اعمال کی جانچ پڑتال کرکے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون میرے امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔

اگر تم نے میری بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق دنیا میں کام کیا تو تمہیں اس دنیا میں بھی امن اور سکون حاصل ہوگا، اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤگے تو میں تمہیں ابدی اطمینان، راحت اور مسرت کا وہ گھر دوں گا، جس کا نام جنّت ہے اور جس کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس دنیا کی لذتوں اور آسائشوں کی کوئی حقیقت

اور حیثیت نہیں ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ دوسرے کسی بھی طریقے کو اختیار کروگے یا طریقہ پر چلوگے (جس پر چلنے کے لئے تم کو اس وقت آزادی حاصل ہے) تو دنیا میں تمہیں بے اطمینانی، فساد اور پریشانیوں کا مزہ چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤگے، تو وہاں پر بھی تمہیں ہمیشہ کے لیے بے اطمینانی، پریشانی رنج والم کے اس گڑھے میں پھینکا جائے گا۔ جس کا نام دوزخ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب نوعِ انسانی کو اس زمین پر بسایا تھا تو اُسے تاریکی اور جہالت کی حالت میں زمین پر نہیں چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ اس کی زندگی کا آغاز وحیِ الٰہی کی روشنی میں کیا تھا۔ اور ان کو جو طریقۂ زندگی بتایا گیا تھا۔

وہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کا نظام یعنی "اسلام" تھا۔

پھر اس کی اولاد (اولادِ آدمؑ) کو بھی یہ بات سکھائی گئی، کہ وہ سرت خدا کے مطیع و فرمانبردار یعنی "مسلم" بن کر رہیں لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اپنی نفسانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہوکر اس صحیح طریقۂ زندگی سے منحرف ہوگیا اور اس نے اسلام کو چھوڑ کر، جاہلیت، کے غلط طریقے اپنا لئے پھر غفلت اور لاپرواہی سے اس نے خدائی ہدایت کو بھی گم کیا اور شرارت سے اُسے مسخ کرنے کی بھی کوشش کی، اس نے خدا کے دیئے ہوئے حقیقی علم میں طرح طرح کے اوہام، نظریات، غلط عقیدوں اور فلسفوں کی ملاوٹ کرکے بے شمار نئے مذاہب ایجاد کر ڈالے اور خدا کی زمین میں فساد برپا کر دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے حلم اور بردباری کی بنا پر لوگوں کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے فوراً پکڑ لینے کا طریقہ بھی نہیں اپنایا ہے کہ غلط مذاہب یا طریقے اختیار کرنے پر انہیں فوراً سزا دے دی جائے حالانکہ ان کی غفلت اور سرکشی کو دور کرنے

کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان پیغمبروں نے اپنے مشن کو بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔ مگر اکثر لوگوں نے شیطان کی پیروی میں ان کی دعوت پر لبیک نہ کہی۔

آخرکار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی کام کے لئے آخری پیغمبر کے طور پر مبعوث فرمایا جس کے لئے پچھلے انبیاء تشریف لاتے رہے تھے۔

بے اطمینانی کے اسباب

"اطمینانِ قلب" کی راہیں تلاش کرنے اور اس کے حصول کا لائحہ عمل تیار کرنے سے پہلے یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قلبِ انسانی کو اطمینان سے محروم کر دینے والے حالات اور عوامل کا بھی تجزیہ کر لیا جائے، تاکہ ان اسباب کو معلوم کیا جا سکے، جن سے دلوں میں بے چینی، حسرت، افسردگی، مایوسی اور بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔

نصب العین کا فقدان

اگر دیکھا جائے تو انسانی زندگی میں نصب العین کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، "نصب العین" اس مرکزی نقطہ کو کہتے ہیں جس پر انسان کی دونوں آنکھیں گڑی ہوئی ہوں اور انسان یکسوئی کے ساتھ اپنی زندگی کی ساری قوتیں اس کو حاصل کرنے میں لگا رہا ہو مگر آج کل ہماری زندگیاں عام طور پر بغیر کسی "نصب العین" کے بسر ہو رہی ہیں۔ حالانکہ انسانی زندگی کو فعال اور متحرک بنانے کے لئے کسی 'نصب العین' کی اشد ضرورت ہوتی ہے، یہ نصب العین ہی در اصل وہ چیز ہے، جس کی بدولت انسان فکر و عمل کے مختلف راستوں میں سے اپنے لئے کسی راستہ کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو مادی اور روحانی وسائل کو اس کے حصول میں صرف کر دیتا ہے۔

"نصب العین" کے متعلق اگر آپ لوگوں سے فرداً فرداً سوال کریں تو آپ

کو مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف جواب ملیں گے اور زیادہ تر لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے یا تو اس سلسلے میں غور کرنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی ہے اور یا بے سوچے سمجھے اور لوگوں کے دیکھا دیکھی بس ایک دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں، اور لوگوں کو جن چیزوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھتے ہیں بس وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں حالانکہ عام طور پہ لوگوں نے جن چیزوں کو اپنی زندگیوں کا نصب العین قرار دے رکھا ہوتا ہے، وہ دراصل انسانی زندگی کا مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ اصل مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہیں اور انسان اُن ذریعوں میں ہی کھو جاتا ہے۔ ذرا سوچیے کہیں آپ کی حالت بھی ایسی ہی تو نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسی ہے تو اس سے جلد از جلد نکلنے کی کوشش کیجیے اور خوب سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا صحیح نصب العین اختیار کرنے کی فکر کیجیے۔ کیوں کہ اس طرح انسان جب اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کیے بغیر یا غلط اور ادھورے مقاصد کی خاطر اپنا سفرِ زندگی شروع کرتا ہے، تو اُسے زندگی کے ٹھوس حقائق کو نگاہ میں نہ رکھنے کی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں اور یہ ٹھوکریں کھا کر وہ ذہنی پریشانی اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور "نصب العین کا فقدان" ہی انسان کے لیے مستقلاً بے اطمینانی کے سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔ مشہور فلسفی آئن سٹائن کہتا ہے "جو شخص اپنی اور اپنے ابنائے جنس کی زندگی کو بالکل بے مقصد سمجھتا ہے، وہ نہ صرف بدنصیب و نامراد ہے بلکہ اُسے زندگی گذارنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے۔"

؎ تو منزلِ مقصود سے آگاہ نہیں ہے
دولت کے سوا کوئی تجھے چاہ نہیں ہے

اے منزلِ مقصود سے غافل انسان
تجھ سا کوئی نادان، کوئی گمراہ نہیں ہے

غلط توقعات

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بے شمار ذہنی جسمانی، دماغی اور مادی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور ہر انسان کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ رکھ دیا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تشکیل اور اپنی خودی کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا رہے اور اپنے گردوپیش کے ذرائع و وسائل، خاندانی رشتوں، سوسائٹی کے مختلف اداروں اور مال و اسباب کو خود اپنی ذات کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کرے، اس سلسلہ میں جب وہ دنیوی مال و اسباب، رشتہ داروں اور سوسائٹی کے مختلف اداروں سے یہ امیدیں وابستہ کرلیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کریں گے اور جب اس کی یہ سہانی امیدیں پوری نہیں ہوتی ہیں تو وہ مایوسی اور بے اطمینانی محسوس کرتا ہے اور اس کے اندر ایک جھنجلاہٹ سی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ شاید دوسرے لوگوں نے بھی اس کی ذات سے بھی ایسی ہی امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں۔

آج بدقسمتی سے جس سوسائٹی کے اندر ہم رہ رہے ہیں، اس کا نظام تعاون للبقاء (Cooperation for Existence) کے اسلامی جذبہ پر قائم نہیں رہا ہے، بلکہ اس سوسائٹی نے بھی خدا پر ایمان نہ رکھنے والی قوموں کی نقالی میں تنازع البقاءُ (Struggle for Existence) کا طریقہ اپنا لیا ہے اور ہر انسان یہاں پر دوسرے انسان کو کہنی مار کر پیچھے دھکیل دینا چاہتا ہے، اور خود آگے بڑھ جانا چاہتا ہے، اس

قسم کی سوسائٹی میں زندگی بسر کرتے ہوئے جب انسان کو اپنا جائز مقام اور جائز حق حاصل کرنے کے لئے سازگار فضا میسر نہیں آتی ہے تو وہ مایوسی اور بزدلی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مغرب کے مشہور فلسفی اسپنوزا (Spinoza) نے اپنے افکار و مباحث کا ماحصل یہی بتایا ہے کہ ہماری امیدوں کا پورا نہ ہونا، ہماری پریشانیوں اور دکھوں کا باعث بن جاتا ہے۔

طولِ اَمل، خواہشات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ

قنوطیت (مایوسی) کا مشہور علمبردار فلسفی "شوپن ہائیر" کہتا ہے کہ انسان کی بے اطمینانی اور بے سکونی کا باعث "ھَل مِن مَّزِید" کا چکر ہے۔ یعنی انسان کی جب ایک خواہش پوری ہو جاتی ہے تو اُسے تسلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں ایک نئی خواہش ابھر آتی ہے اور اس طرح خواہشوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جو انسان کو بالآخر بے نصیبی اور مایوسی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے، جب کوئی انسان اپنی رہائش کے لئے ایک مکان یا ایک بنگلہ بنا لیتا ہے تو اُسے دوسرا بنگلہ تیار کرنے کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے، جب سواری کے لئے اسے سائیکل میسر آجاتی ہے تو وہ سکوٹر اور موٹر سائیکل کے حصول کے لئے بے چین ہو جاتا ہے، جب اُسے سکوٹر مل جاتا ہے تو اس کے دل میں کار کی خواہش اُبھر آتی ہے۔

خواہشات کا یہ تسلسل اُس کے دل کو بے اطمینانی کی آماجگاہ بنا دیتا ہے، لمبی لمبی امیدوں اور خواہشات کے اس چکر کی اسلام نے پُرزور مذمت کی ہے اور حدیث شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "طولِ امل" یعنی خواہشات کے لامتناہی سلسلہ کی مذمت کی ہے۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت اسلامیہ کا بار سونپتے وقت یہ وصیت فرمائی تھی کہ "اے عمرؓ! طول امل سے اپنے آپ کی حفاظت کرنا کہ آپ کے نفس میں دنیا کی ایک خواہش پیدا ہوگی، جب وہ پوری ہو جائے گی تو دوسری خواہش ابھر آئے گی، اپنے آپ کو ان لمبی خواہشات سے بچائے رکھنا

قرآن پاک کی سورۃ "التکاثر" میں بھی انھی جذبات کی طرف اشارہ کر کے ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔

"تم لوگوں کو دنیا کا مال زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور دوسروں سے بڑھ کر حاصل کرنے کی خواہش نے خدا سے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ تم یہی فکر لئے قبر کے کنارے پہنچ جاتے ہو، اس کا برا انجام تمہیں عنقریب (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) معلوم ہو جائے گا اور ضرور معلوم ہو جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے چند دن قبل جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں بھی صحابہ کرام اور مسلمانوں کو جس بات پر متنبہ فرمایا گیا تھا، وہ یہی تھی کہ:-

مَا الفقر اَخشٰی عَلَیکُمْ وَلٰکِنْ اَخْشٰی عَلَیکُمْ ان سبط الدنیا عَلَیکُمْ کَمَا بسطت علیٰ مَن کَانَ قَبلکُمْ فتنافسو کَمَا تنافسوھا فتھلکم کَمَا اَھلکتھُمْ۔

مجھے تمہارے بارے میں غریبی اور بھوک کا خطرہ نہیں ہے مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا ہے کہ دنیا کی تم پر ایسی فراخی اور کشائش ہو جیسے تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی

اور تم- اسی میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کر دے جس طرح اگلوں کو ہلاک کیا۔

۴- مال و دولت کی حرص

انسان کے پاس اپنی بسر اوقات کے لئے چاہے ضروری سامان موجود ہو لیکن زیادہ مال کے حصول کے لئے اس کی خواہشات بہت زیادہ ہوتی ہیں اس کے دل میں بار بار یہ خیال گذرتا ہے کہ جو مال اس کے پاس موجود ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی یہ خلش جبھی دور ہو سکتی ہے جب اس کو اس بات کا اطمینان ہو کہ اگر اس کا پہلا مال ضائع ہو گیا یا اس پر کوئی مصیبت آ گئی تو دوسرا مال اس کے پاس موجود رہے۔

دراصل انسان اپنی ذات یعنی شخصیت کی تعمیر میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی ضروریات کے لئے بہت طول طویل اندازے لگاتا رہتا ہے اور اپنے لئے نئی نئی آفتوں اور مصیبتوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہے اور ان کے موہوم اندیشوں سے لرزہ براندام رہتا ہے۔

ان اندیشوں سے بچنے کے لئے اس کے نزدیک سب سے بڑا ذریعہ زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا قرار پاتا ہے۔ اس کا یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مقدار پر بھی قانع نہیں رہنے دیتی۔

اسی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

"دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے۔ علم کا حریص اور مال

کا حریص"

اسی طرح "مال کے حریص" کا دل بھی ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے. حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ دنیا پرستی اور دنیا سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہوئے، اپنی کتاب "فیوض یزدانی" میں لکھتے ہیں کہ:-

"دنیا سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھڑا پا کر کھا، کہ وہ طباق اپنے سر پر رکھے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالٰے کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے، اس کو ذلیل کرتی ہے. کھا حق تعالٰے کے ساتھ عزّت اور تونگری کے قدم پر."

ایک دوسرے موقع پر آپؒ ارشاد فرماتے ہیں.

دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز

جیب میں رکھنی جائز

کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز

باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں کہ اُسے دل میں بھی محبوب سمجھنے لگے

دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز

مگر دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزّت ہے.

~ دنیا میں تو دنیا کا طلب گار نہ بن
یہ چیز ہے ناکارہ خریدار نہ بن

جز یادِ خدا روح کو تسکین کہاں
اے مردِ خدا رونق بازار نہ بن

ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک بزرگ اپنے گھر میں بیٹھے عبادت میں مصروف تھے کہ ان کے دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ جب وہ دستک کی آواز سُن کر دروازہ پر آئے اور دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے کہ "ایک نہایت حسین وجمیل عورت ازرق برق لباس پہنے اُن کے دروازہ پر کھڑی ہے، انہوں نے حیران ہوکر پوچھا کہ تو کون ہے۔ اس عورت نے جواب دیا کہ میں دولت ہوں اور میں اندھی ہوں، مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے، مجھے اپنے گھر میں پناہ دیجیئے، وہ بزرگ جو ایک سچے مومن تھے وہ اس کی چال کو سمجھ گئے اور فرمانے لگے کہ اے دولت تو کوئی اور گھر تلاش کر، میرے پاس تیرے لئے جگہ نہیں ہے کیوں کہ جس طرح تو خود اندھی ہے توجس کے پاس بھی جاتی ہے اُس کو بھی اندھا کردیتی ہے۔ اس لئے مجھے معاف رکھ۔"

۵۔ معیارِ زندگی کی بلندی کا چکّر

"اطمینانِ قلب" سے محرومی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کے اعلیٰ وارفع مقاصد کو چھوڑ کر محض "معیارِ زندگی" کی بلندی کے چکّر میں پڑ گیا ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جائز یا ناجائز ذرائع اختیار کرکے ایک دوسرے سے اپنا معیارِ زندگی بلند کرکے لے جائے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے لئے اُسے نہ محنت کرنی پڑے، اور نہ اپنا وقت ہی صرف کرنا پڑے ہر شخص پر ایک پُرتکلف اور امیرانہ زندگی کا خیال مسلط ہوگیا ہے اور یہ تکلّفات اس کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے ہیں، اور دلوں میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ پوری شہری زندگی اور پورا نظام تمدن اس کی لپیٹ میں آگیا ہے

ہر شخص دنیوی مال واسباب کے معاملہ میں اپنے سے کمزور تر آدمی کو دیکھنے کی بجائے اپنے سے اوپر والے آدمی کو دیکھتا ہے۔ اس بیماری نے ایک لاعلاج مرض کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر امیر و غریب کے سر پر غموں اور پریشانیوں کا ایک بوجھ لاد دیا ہے۔ ہمارے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے اندر ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے جس کے نتیجے میں کھیل کود کے سامانوں، عجیب وغریب کھلونوں، آرائش کی چیزوں اور لباس و زینت کے انواع واقسام کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے ہمارے بازار نئی تراش خراش کے لباسوں، نئی وضع قطع کے بوٹوں اور جوتیوں اور دوسرے زرق برق لباسوں اور سامانِ آرائش سے جگمگا رہے ہیں۔ پھر فوراً ہی یہ چیزیں ہمارے لئے پرانی اور فرسودہ قرار پا جاتی ہیں اور برائے نام شکل وصورت کی ترمیم کے ساتھ نیا سامان ان کی جگہ لے لیتا ہے، زینتِ حسن و ترقی کا معیار روزانہ بدلتا ہے اور برابر بدلتا رہتا ہے۔ کارخانوں کی طرف سے بے ضرورت تفریح اور آرائشی سامانوں کی پیداوار اور ان کی باہمی مسابقت اور رقابت نے لوگوں کی زندگی کو روز بروز گراں، معیارِ زندگی کو ہر گذرے ہوئے دن سے بلند کر دیا ہے۔ کہ اس کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی آمدنی بھی ناکافی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور یہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے، یہ حالات انسان میں ایک دائمی ہیجان اور بے پردگی کا یہ ماحول جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان صبر وضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو، انہی باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ "قناعت" کا لفظ ایک لفظِ بے معنی بن کر رہ گیا ہے، کسی انسان کو بقدرِ ضرورت رزق مل جانے پر یا کچھ کم رزق ملنے پر قناعت

کرنے کی عادت نہیں رہی ہے۔

سکون و اطمینان قلب خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے، ہر شخص اپنے سامنے اپنی موجودہ حالت سے بلند معیار زندگی رکھتا ہے اور اُسے حاصل کرنا سب سے بڑا فرض سمجھنے لگتا ہے، یہ غلط ماحول بھی اُسے اسی کی ترغیب دیتا رہتا ہے اور اس کے بغیر وہ خود کو ذلیل سمجھتا ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بڑھ گئی ہے اور جو گھر آسانی کے ساتھ جنت کا نمونہ بن سکتے تھے۔ اور جن میں زندگی کے سب حقیقی لوازم پائے جاتے تھے، کسی نہ کسی موہوم اور خیالی چیز کی کمی کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ بن گئے ہیں۔ جہاں حقیقی عیش اور قلبی اطمینان عنقا ہو گیا ہے۔

معیارِ زندگی کی بلندی کے اس چکر سے نکلنے کے لئے قناعت و استغنار کے جذبات کی پرورش کی ضرورت پڑتی ہے۔ قناعت و استغنار کا مطلب یہ ہے کہ انسان باعزت طریقہ سے اپنے رب کا فضل تو تلاش کرتا رہے اور اس طرح جو دنیوی ساز و سامان اُسے میسر آجائے، اُسے خدا کی مہربانی سمجھ کر اُس پر قناعت بھی کرے اور زیادہ مال حاصل کرنے حرص و ہوس اور حسد جیسے گھٹیا جذبات سے بچتا بھی رہے اور غلط اور ناجائز ذرائع اختیار نہ کرے اور اس بات پر بھی یقین رکھے کہ رزق کی کنجیاں اللہ تعالےٰ کے پاس ہیں، وہ جس کو جتنا رزق چاہتا ہے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھین بھی لیتا ہے۔

دوبئی ازم یعنی بیرون ملک جانے کی دوڑ

آج خدا فراموشی کی وجہ سے دنیا بھر میں ترقی کے نام سے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی جو دوڑ لگ رہی ہے اس سے اہلِ پاکستان بھی بُری طرح متاثر ہوئے ہیں اور یہاں پر بھی اس وبا نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب یہ طوفان کوُ بہ کوُ گھر بہ گھر پھیل رہا ہے ہر طبقہ کے گھروں اور افراد کے سامنے، قطعۂ زمین، مکان یا کوٹھی، سکوٹر یا کار ٹیلی ویژن اور فرج، ائیر کنڈیشنز اور کپڑے دھونے کی مشین، قالین اور فرنیچر جدید چولھے اور ہیٹر، گدے دار پلنگ اور دروازوں، کھڑکیوں کے پردوں کی بے حساب خواہشات کی لمبی فہرست ہے اور ہر شخص ان کے حصول میں دوڑ لگا رہا ہے، وہ دینی عبادات، اسلامی شعائر، خاندانی روایات اور اخلاق کے خزانوں کو ایک ایک کر کے پھینکتا چلا جاتا ہے کہ وہ اس دوڑ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی تمیز سے بے نیاز ہو کر ہر قیمت پر روپے کو حاصل کرنا اور آمدنی کو بڑھانا چاہتا ہے، رشوت ہو کہ اسمگلنگ، ملاوٹ ہو کہ بھاری منافع اور گراں فروشی، قومی املاک میں خیانت ہو یا امانتوں میں خرد بُرد اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر چوری، لوٹ مار، جیب تراشی، سڑکوں پر بسیں روک کر ڈاکہ زنی، خرکاروں کے لئے بچوں کا اور بدمعاشوں کے لئے عورتوں کا اغوا اور قتل جیسے سارے جرائم لوگوں کو پسندیدہ نظر آرہے ہیں۔ جب کسی گاؤں یا محلے کا ایک شخص بیرون ملک جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد جب روپیہ اس کے گھر میں ناچنے لگتا ہے، تو اڑوس پڑوس میں مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو باہر جانے کی تلقین کرنے لگتی ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھتی ہیں کہ ایک معمولی گھرانے کے آدمی نے باہر

جاکر تھوڑے عرصہ میں ہی اتنا روپیہ کما لیا ہے کہ اس کا گھر عجیب وغریب کپڑوں اور مشینوں سے بھر گیا ہے۔ اب وہ قصاب کے ہاں جاتا ہے تو ۵ سیر گوشت کا آرڈر دیتا ہے۔ پھل والے سے پانچ منٹ میں سو روپے کا پھل اٹھا لیتا ہے زمین یا دکان کا پلاٹ خریدنے نکلتا ہے تو مارکیٹ ریٹ سے کہیں زیادہ رقم ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنے ان پڑھ بھائی یا بیٹے کے لئے بیٹری سیل والی گھڑیاں بھیجتا ہے، جن کے ڈائل کو وہ اچھی طرح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ گڈریا بکریاں چرا رہا ہے اور چار بینڈ کا ریڈیو کیکر کی چھاؤں میں رکھ کر گانے سُن رہا ہے، جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا، بوڑھی نانیوں اور دادیوں کی کلائیوں پر اب گھڑیاں بندھی ہیں۔

کیا یہ دولت جیسی نعمت خداوندی سے مذاق اور اس کا ضیاع نہیں ہے ہمارے موجودہ دولت پرستانہ ماحول میں یہ حقیقت کسی کو یاد ہی نہیں کہ دولت اللہ تعالےٰ کی امانت ہے اسے عیاشی، فضول خرچی اور غیر ضروری اشیاء کی خریداری پر ہرگز صرف نہیں ہونا چاہیئے۔

آج لباسوں، خصوصاً خواتین کی ساڑھیوں اور غراروں، بیل باٹم اور دوسرے ملبوسات کا اسراف یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ کسی زنانہ ادارے میں چلے جائیے تو معلوم ہوگا کہ فاخرہ لباسوں کا کوئی مقابلہ ہو رہا ہے۔ راہ چلتی عام عورتوں کو دیکھ کر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مینا بازار کو جا رہی ہیں۔ یہ سارا بوجھ خاوندوں یا باپوں یا بھائیوں کی آمدنی پر پڑتا ہے اور وہ بے چارے جب رزقِ حلال سے اسے پورا نہیں کر سکتے تو حرام کے راستوں سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر بیرونِ ملک جانے والے ہمارے بھائی یہ بھی نہیں سوچتے کہ اپنے گھر بار چھوڑ کر، بال بچوں کو چھوڑ کر، وطن سے ہزاروں

میل دُور جس کمائی کے لیئے گئے ہیں اس کمائی ہوئی دولت سے قیمتی چیزیں خرید خرید کر زرِمبادلہ کو ضائع کر کے خود اپنے ملک کو اور اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مگر معیارِ زندگی کی بلندی کا یہ گھناؤنا چکر انہیں یہ سوچنے ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنی کمائی سے ملک کو (Production) دینے والی مشینری خریدیں اور سامانِ تعیش پر اُسے ضائع نہ کریں۔

تقسیمِ رزق کی حکمت سے بے خبری

ہر انسان اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروریاتِ زندگی کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ ضروریات پوری کرنے کے لئے اُسے مال و دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مال و دولت کے حصول کے لئے وہ اسباب و ذرائع تلاش کرتا ہے اور اس کے لئے تگ و دَو کرتا رہتا ہے یہ انسان کی ایک فطری ضرورت اور اس کا ایک فطری جذبہ ہے مگر اس حصولِ معاش اور کسبِ رزق کے معاملہ میں بھی جب وہ توازن قائم نہیں کر پاتا اور اس کائنات کے اندر تقسیمِ رزق کے جو ضابطے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھے ہیں، اور اس سلسلہ میں جن حقائق سے اُسے سابقہ پیش آتا ہے، اُن کو اپنے ذہن میں نہیں رکھتا، تو رزق کے معاملہ میں انسان کی حد سے بڑھی ہوئی فکر مندی اس کے دل میں بے اطمینانی اور پریشانی پیدا کر دیتی ہے۔

وسائلِ رزق اور تقسیمِ رزق کے معاملات پر غور کرنے سے چند حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، جن کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو ہم رزق کی کمی اور بیشی کے سلسلہ میں بے اطمینانی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

پہلی حقیقت

سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی پیدائش کے موقع پر جب اپنی ماں کی گود میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ نہ وہ چلنے پھرنے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ تلاشِ رزق کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے قابل ہوتا ہے اس حالت میں اللہ تعالےٰ جو انسان کے خالق ہیں اور رزاق بھی ہیں، انہوں نے اپنی کمالِ رحمت سے ماں کی چھاتیوں میں دودھ تیار کر رکھا ہوتا ہے۔

پھر جب وہ دودھ کے علاوہ کوئی چیز کھانے پینے کے قابل ہوتا ہے اور ذرا چلنے پھرنے لگتا ہے تو اس کے ماں باپ اور دیگر رشتہ دار نہایت محبت سے اس کی ضروریات پوری کرتے رہتے ہیں اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اُسے سکولوں اور کالجوں میں داخل کرا دیتے ہیں اور اس کے تمام اخراجات برداشت کرتے رہتے ہیں۔

اگر انسان اپنی اس تعلیمی زندگی سے صحیح فائدہ اٹھا کر علم حاصل کرنے اور اپنی خداداد دماغی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کی طرف متوجہ رہے تو وہ اپنے اندر ایسی صلاحیتیں اور قابلیتیں پیدا کر لیتا ہے کہ سوسائٹی میں اُس کو آسانی سے حسبِ حال کام بھی مل جاتے ہیں اور اس کی معاش کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

اور اگر انسان اپنے طالب علمی کے اس زمانہ کی قدر نہ کرے اور فضول اور غلط کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتا رہے۔ غلط دوستوں کی مجلسوں کے چکر میں پڑ کر علم حاصل کرنے کی بجائے، تاش کھیلنے، سینما دیکھنے، عشقیہ ناول پڑھنے، پتنگ بازی اور کبوتر بازی جیسے مشاغل میں اپنے یہ قیمتی اوقات ضائع کر دے، تو اُسے اپنی آئندہ زندگی میں جب محرومیوں کا احساس ہوتا ہے تو سوائے بے اطمینانی

اور پریشانی کے اُسے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

تقسیم رزق کے معاملہ میں ایک اور حقیقت کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان مرد و عورت کے اندر توالد و تناسل (اولاد پیدا کرنے) کی صلاحیتیں رکھی ہیں اور مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات کی بنا پر یہ ایک خاندان وجود میں آتا ہے، تو قدرتی طور پر ہر انسانی جوڑے کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور ظاہر ہے ہر انسان کے مالی یا معاشی حالات ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، کوئی غریب ہوتا ہے، کوئی امیر ہوتا ہے، کوئی متوسط درجے کے مالی وسائل رکھتا ہے، مگر اولاد چونکہ ہر ایک کے ہاں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہر انسان مختلف مالی حالات لئے ہوتا ہے۔ قدرت کا چونکہ یہ نظام نہیں ہے کہ اولاد صرف امیروں کے ہاں پیدا ہوگی، غریبوں کے ہاں نہ پیدا ہوگی، بلکہ بعض اوقات بڑے بڑے امراء کے ہاں اولاد پیدا ہی نہیں ہوتی ہے اور غریب لوگ اولاد کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اگر کمزور یا متوسط درجے کے مالی وسائل رکھنے والے افراد اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنی خداداد صلاحیتوں کو نشوونما دینے کی بجائے اپنے سے بہتر مالی وسائل رکھنے والوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اُن پر کڑھتے ہی رہیں اور امیر غریب کے طبقاتی چکر میں پڑ کر باہمی لڑائیاں ہی کرتے رہیں تو وہ اطمینانِ قلب سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے زمین و آسمان میں، دریاؤں اور سمندروں

میں، جنگلوں اور صحراؤں میں، پہاڑوں اور فضاؤں میں، رزق کے وافر خزانے پھیلا دیئے ہیں اور انسانوں کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے معاشی نظام کے اصولوں کو اپنا کر رزق کے ان وسائل سے فائدہ اٹھائیں تاکہ اس زمین پر بسنے والے ہر ہر فرد کو ضرورت کے مطابق رزق ملتا رہے اور کوئی بھی اس سے محروم نہ رہے۔ مگر انسانوں نے اپنی نادانی کی وجہ سے ایسے معاشی نظام اپنا لیئے، جنہوں نے سوسائٹی کے بیشتر افراد کو رزق سے محروم کر دیا، کہیں سرمایہ دارانہ نظام اپنایا گیا، جس نے دولت کو چند گنے چنے افراد کے پاس سمیٹ دیا اور عام لوگ محرومیوں کا شکار ہو گئے اور کہیں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں سے "تنگ آکر ردِ عمل (Reaction) کے طور پر گمراہی کی دوسری انتہا کو اختیار کر کے کمیونزم اور اشتراکی نظاموں کو اپنا لیا گیا، جس نے انسانیت کو آزادئ فکر و عمل جیسی نعمتوں سے محروم کر دیا، حالانکہ اگر وہ اپنے "خالقِ حقیقی" کے بتائے ہوئے معاشی نظام کو اپنا لیتے تو ہر فرد کے لئے رزق کی فراہمی کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور رزق سے محروم لوگوں کے لئے رزق کی تقسیم کے مستحکم ادارے بھی قائم ہو جاتے۔ ہماری ان کوتاہیوں نے بھی ہمیں بے اطمینانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

تقسیم رزق کے معاملہ میں ہماری ان کوتاہیوں اور بے اعتدالیوں کے باوجود ہمارے رحیم و کریم اور مہربان خدا نے ہمارے دلوں کو مطمئن رکھنے کے لئے کچھ ایسے ضابطوں کی طرف اشارات فرمائے ہیں جو ہر قسم کے حالات میں اطمینانِ قلب کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہیں، تاکہ ہم ناموافق حالات میں صبر اور شکر کا دامن نہ چھوڑ بیٹھیں اور دل کی بے اطمینانی کی وجہ سے اپنی خداداد فطری صلاحیتوں کی پاسداری اور ان کی نشو و نما سے غافل نہ ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے :۔

◉ کہ جس طرح ہم نے تمہاری پیدائش سے قبل ہی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی فراہمی کا اہتمام فرما دیا تھا، اسی طرح ہم تمہاری زندگی کے ہر مرحلہ میں تمہارے رزق کا انتظام فرماتے رہیں گے، کیونکہ ہر جاندار کا رزق ہم نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

◉ کہ ہر انسان کو اس کی قسمت کا رزق مِل کر رہتا ہے اور کسی انسان کو اس وقت تک موت ہی نہیں آتی جب تک وہ دنیا سے اپنا مقررہ رزق حاصل نہیں کر لیتا ہے اور انسان کو صرف اس بات کا مکلّف کیا گیا ہے کہ اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق اپنا رزق حاصل کرنے کے ظاہری اسباب اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔

◉ کہ انسان رزق کے معاملہ میں کیوں بے صبر اور پریشان ہے۔ کیا وہ دیکھتا نہیں ہے کہ پرندے اور چرندے صبح سویرے خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو اُن کا اب پیٹ بھر کے واپس گھونسلوں میں پہنچاتا ہے؟

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ باغات میں سوسن اور سفیدہ کے درختوں کے اونچے اونچے تنوں کو اللہ تعالےٰ نے کیسے خوبصورت لباس سے مزیّن کر رکھا ہے۔

◉ کہ جو خدا پرند و چرند اور کیڑوں مکوڑوں کو رزق پہنچانے اور درختوں تک کے خوبصورت لباس سے غافل نہیں ہے۔ کیا وہ انسان جیسی اشرف المخلوقات کو رزق و لباس سے محروم رکھے گا۔

ہاں البتہ یہ حقیقت بھی ہر انسان کو اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ

جو اس کائنات کے وسیع نظام اور مخلوقات کی بے شمار اقسام کی ضروریات کا انتظام فرما رہے ہیں، وہ اپنی خاص حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت، کسی کو وافر اور کھلا رزق دے رہے ہیں، کسی کو نپا تلا رزق مل رہا ہے اور کسی کو بعض اوقات ضروریات سے بھی کم رزق میسر فرماتے ہیں یا ہم خود اپنی نادانیوں سے اپنے رزق کی تنگی کے اسباب فراہم کر لیتے ہیں۔

ان تمام حالتوں میں اس کے پیشِ نظر کچھ مصالح ہوتے ہیں اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کے ناموافق حالات میں بھی صبر و شکر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دے اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے ان حالات کو بدلنے کی کوشش بھی کرتا رہے۔

؎ کیوں شام و سحر رزق کا غم کھاتا ہے
کیوں ہاتھ درِ غیر پہ پھیلاتا ہے
اندیشہ نہ کر دیکھ کہ رزاقِ جہاں
جو حصّہ ہے تیرا، تجھے پہنچاتا ہے

۷۔ عاداتِ بد اور مجرمانہ ذہنیت

اگر کسی انسان کے اندر مجرمانہ ذہنیت اور بُری عادتیں پیدا ہو جائیں تو یہ بھی انسان کے لئے بے اطمینانی کا سبب بن جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک ضمیر عطا فرمایا ہے جس کے اندر نیکی اور بدی میں تمیز کرنے اور صحیح و غلط

کام کی پہچان کا ملکہ رکھ دیا ہے، جس کی بناء پر جب بھی کوئی انسان غلط کام کرنے لگتا ہے یا بدی کی طرف مائل ہونے لگتا ہے تو اس کا ضمیر اُسے ٹوکتا ہے اور جب وہ ضمیر کی پاکیزہ آواز کو دبا کر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس کے دل میں بے اطمینانی کی ایک خلش پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح بُری عادات بھی اس کی بے اطمینانی کا باعث بنی رہتی ہیں اور جب کوئی شخص کسی اخلاقی یا قانونی جُرم کی بناء پر قانونی شکنجے میں آجاتا ہے اور اُسے قید یا جرمانے کی سزا ہوجاتی ہے تو پھر واویلا کرنے لگتا ہے اور خود بھی بیقرار ہوتا ہے اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی پریشان رکھتا ہے۔

۸۔ جذباتی پن

انسانی زندگی کی خاص مصلحتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر مختلف جذبات اور خواہشات رکھی ہیں اور جب بھی کوئی انسان ان خواہشات اور جذبات کا غلط استعمال کرتا ہے اور اُن پر مناسب حد تک کنٹرول نہیں کرتا تو اس بے اعتدالی کی بناء پر اُسے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان کی زندگی مصائب کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ اس کا اطمینان رخصت ہوجاتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو محبت کا جذبہ عطا کیا ہے، اگر انسان محبت کے اس جذبہ کو خیر اور بھلائی کے کاموں میں استعمال کرے تو انسان کی زندگی سنور جاتی ہے اور اسی محبت کے جذبہ کو شر اور برائی کے لیے استعمال کرے تو اس کی زندگی کا سکون رخصت ہوجاتا ہے، اسی طرح انسان کے اندر نفرت اور غصّہ کا ایک جذبہ

رکھا گیا ہے کہ انسان جب کوئی غلط کام ہوتے دیکھے تو اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو اور جب وہ اپنی طبیعت کے خلاف یا بدی کا کوئی کام دیکھے تو اس کے دل میں غصّہ کی کیفیت پیدا ہو۔ یہ غصّہ اگر انسان کنٹرول میں رکھے اور آپے سے باہر ہو کر یا غصّہ سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھے جس کی انسانیت یا قانون اجازت نہ دیتا ہو، تو وہ شخص مطمئن رہتا ہے اور اگر غصّہ سے مغلوب ہو کر کسی ملکی یا اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھے گا تو اس کی سزا اُسے بھگتنی پڑے گی۔ جس سے اس کو مصائب و پریشانیوں کا سامنا ہو گا۔

۹۔ زندگی گذارنے کیلئے صحیح مذہب اختیار نہ کرنا

ہر انسان کے لئے دنیا میں اپنی زندگی گذارنے کے لئے کسی نہ کسی مذہب کو اختیار کرنا یا کسی ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی ایسے مذہب کو اختیار کرے جو اسے زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق ہدایات یا راہنمائی نہ دیتا ہو اور اس کے سامنے کوئی ایسا نظامِ فکر و عمل نہ رکھتا ہو، جو انسان کی حیوانی اور جسمانی ضروریات کو بھی احسن طریقہ سے پوری کرتا ہو، اس کے ذہن کو صحیح افکار و خیالات سے منوّر کرتا ہو اور اس کی روحانیت کی بھی صحیح صحیح آبیاری کرتا ہو، تو اس کی زندگی سکون و اطمینان سے خالی ہو جاتی ہے۔

اس لئے انسان کے "اطمینانِ قلب" کے لئے جہاں ایک صحیح نصب العین کی

ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ایک ایسے ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، جو اس کی زندگی کی تمام ضروریات اور مطالبات کو ملحوظ رکھتا ہو۔

ایسے مذہب میں یہ صفت ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ انسان کے عقل و فہم کو قائل کرے، اس کی روح کی تسکین کا سامان کرے، غلط مذہب اختیار کرنے سے بھی انسان سکونِ قلبی سے محروم ہو جاتا ہے پھر اس مذہب کا کائنات کے عمومی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔

۱۰۔ خدا فراموشی اور ذکرِ الٰہی سے غفلت

انسان کی بے اطمینانیوں کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انسان خدا کی یاد سے غافل ہو کر جب خدا فراموشی اختیار کرتا ہے تو وہ خود اپنی خودی کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس طرح سے اُسے نہ اپنی قدر و قیمت ہی معلوم ہوتی ہے اور نہ اُسے انسان کی عظمت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور جب وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو اس کی مثال درخت کے ٹوٹے ہوئے اُس پتے کی سی ہو جاتی ہے جسے غلط نظریات اور باطل افکار و خیالات کی تند و تیز ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑائے پھرتی ہوں اور اس کو کسی گل چین زمانے کی خدا فراموشی کا یہ رویہ انسان کو ہر دم بے قرار و بے چین رکھتا ہے۔

اطمینانِ قلب کی راہیں

پچھلے ابواب میں "اطمینانِ قلب" کی تلاش سے تعلق رکھنے والے امور کے متعلق ہم نے جو بحث کی ہے، اس سے چند بنیادی حقیقتیں تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آگئی ہیں۔

وہ خلاصۂ بحث کے طور پر درج ذیل ہیں۔ یہ کہ:

انسان کی شخصیت تین مستقل اجزاء سے مرکب ہے

ان تین اجزا میں پہلی چیز انسان کا "جسم" ہے

دوسری چیز انسان کا نفس، ذہن یا ضمیر ہے۔

اور تیسری چیز اس کی "روح" ہے۔

جسم کی تخلیق "مٹی" سے ہوئی ہے اور انسانی جسم کا ڈھانچہ ذہن اور روح کے لئے مرکب یعنی سواری کا کام دیتا ہے اور ذہن و روح اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اسی جسم سے کام لیتے ہیں۔

نفس کے اندر کچھ ضروری "خواہشات" اور جذبات رکھے گئے ہیں، جو انسان کی شخصیت کی تعمیر اور پرورش میں امداد دیتے ہیں۔

نفسِ انسانی کی صفات کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں۔

نفسِ امّارہ - نفسِ لوّامہ - نفسِ مطمئنہ

جن کی تشریح نفسِ انسانی کی بحث میں کی جا چکی ہے۔

انسانی جسم کے اندر دل کو بھی اہم اور مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ دل کا تعلق بیک وقت انسان کے جسم کے ساتھ، اس کی روح اور اس کے دماغ کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے۔

کائنات

یہ کائنات جس میں انسان رہتا ہے اس کی بھی کچھ خصوصیات ہیں۔

یہ کائنات قدرتی مناظر اور حسن وجمال سے مالامال ہے۔

اس کائنات کی ہر چیز کی تخلیق حکمتوں سے بھرپور ہے۔

اس کائنات کے اندر انسان کے لئے بے شمار نعمتیں اور منافع ہیں جن سے وہ دن رات فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس کائنات کے ہر کام میں مقصدیت ہے یعنی اس کی ہر چیز بامقصد پیدا کی گئی ہے بے مقصد نہیں۔

خود انسان کی پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے جس کو سمجھنا اور اس کا شعور حاصل کر کے اس کی تکمیل کے لئے کام کرنا انسان پر واجب اور لازم ہے۔

یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ انسان اس کائنات میں اپنی حیثیت کو جان لے، اپنے خالق اور اس کی صفات کو پہچان لے، اپنے انجام کو سمجھ جائے اور ہر وقت اس کو مدِ نظر رکھے۔

مندرجہ بالا حقائق کے علاوہ انسان کے لئے دو اہم تقاضوں کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اوّل:۔ اپنی زندگی کا کوئی صحیح اور واضح نصب العین متعین کرے۔

دوئم :۔ انسان اپنی زندگی کے لئے ایسا مذہب / دین اختیار کرے جو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو۔

سوئم :۔ اس سے اس کے جسم کی مادی ضروریات بھی پوری ہوتی ہوں۔ اس کے نفس اور ذہن کے بھی تمام مثبت تقاضے پورے ہوتے ہوں اور اس کی روحانیت کو بھی غذا ملتی ہو۔ یہ نظام فکر و عمل اُسے خدا فراموشی اور خود فراموشی کے اندھیروں سے نکال کر خدا آگاہی اور خود آگاہی کی نعمتوں سے مالا مال کر دے تاکہ کسی لمحہ انسان اپنے خالق، رازق، پروردگار، مالک، آقا اور حقیقی معبود سے غافل نہ ہونے پائے اور ہر قسم کے موافق اور ناموافق حالات میں اُسے ذکرِ الٰہی کے سرور سے سرشار رکھے۔ تاکہ اُسے جسمانی آسائشوں کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین بھی ملتی رہے اور اس کا دل و دماغ مطمئن رہے۔

زندگی کا صحیح نصب العین

ہم جب نوعِ انسانی کی پیدائش کے نظام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانیت کی پیدائش کی ابتدا تو ایک مٹی کا پُتلا بنا کر اور اس میں اپنی طرف سے ایک رُوح پھونک کر فرمائی تھی، مگر بعد میں انسانی نسل کی افزائش کا طریقہ توالد و تناسل کے ذریعہ مقرر فرما دیا۔ اور اب انسان کی پیدائش کی ابتداء پانی کی ایک حقیر بوند سے ہوتی ہے اور ماں کے پیٹ میں جب اس کے جسم کا گوشت پوست اور ہڈیاں وغیرہ تیار ہو رہی ہوتی ہیں اور اُس کی شکل و صورت بنائی جا رہی ہوتی ہے تو اس موقع پر سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

اس طرح انسان اپنی پیدائش کے بعد بھی کئی سال تک شیر خوارگی، بچپن اور طالب علمی کے زمانہ میں اپنے ماں باپ کی محبت اور پرورش کا محتاج رہتا ہے۔

اس طرح سے پروان چڑھ کر جب وہ جوانی کی حد کو پہنچتا ہے اور اپنے اندر خود اپنی روزی کمانے کی طاقت اور غور و فکر کی صلاحیتیں اور شعور محسوس کرتا ہے۔ تو کیا اُسے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے خدا کا جس کی بے شمار نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے بلوغت کی حد کو پہنچا ہے۔ انکار کر دے؟ اور اُس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق نہ تو زندگی گذارے اور نہ ہی اُس کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے؟ کیا خدا فراموشی کے اس رویّہ کو کسی طرح بھی جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

انسان اپنی جوانی کے عالم میں جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کائنات میں اس کے گرد و پیش اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے رزق کے بے پناہ وسائل اور خزانے موجود ہیں اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ان کو استعمال میں لانے اور ان میں تصرف کرنے کے پورے اختیارات بھی رکھتا ہے اور ان اختیارات کو محدود کرنے والی بظاہر کوئی ہستی بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اور پھر وہ اپنے گرد و پیش کے انسانوں اور ماحول کو پوری طرح دنیا پرستی میں مبتلا پاتا ہے تو اسے بھی خدا پرستی کا راستہ اختیار کرنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔

در آنحالیکہ وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بے پناہ اختیارات دے کر اور کائنات کے وسائل کو تصرف میں لانے کی قوتیں دے کر اور دوسری تمام مخلوقات پر اسے فضیلت دے کر۔ دراصل اُسے

دنیا میں اپنے نائب اور خلیفہ (VICEROY) کی جو حیثیت دی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے مالک اور بادشاہ کے مقرر کردہ ضابطوں اور قوانین کے مطابق کام کرے اور اپنے خدا کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے کو ہی اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین قرار دے لے تاکہ وہ دنیا میں بھی خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکے اور آخرت میں بھی اس کے انعامات کا مستحق قرار پائے، اس کے علاوہ کوئی اور نصب العین بھی انسان کی زندگی کے لیئے مفید نہیں ہو سکتا ہے۔

صحیح مذہب اور کامل نظامِ زندگی

انسان کے لیئے جہاں ایک صحیح نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے وہاں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیئے ایک صحیح مذہب اور کامل نظام زندگی کا انتخاب کرے، جو اس کی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو تاکہ انسان یکسوئی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی بسر کر سکے۔

اس میدان میں بھی جب ہم غور و فکر کے لیئے نکلتے ہیں تو ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے کیوں کہ ہمارے مہربان خدا نے ابتدائی زمانہ سے ہی ہماری راہنمائی اور ہدایت کے لیئے ہم انسانوں میں سے ہی برگزیدہ شخصیتوں کو پیغمبر بنا کر بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا، جو ہم تک حالات زمانہ کی مناسبت سے خدا کا سچا پیغام پہنچاتے رہے۔ اور آخر کار آخر الزمان پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین حق کی تکمیل فرما دی اور اپنی طرف سے پیغمبروں کی ترسیل کا سلسلہ بند فرما دیا اور قیامت تک کے لیئے تمام انسانوں کے لیئے "اسلام" کو

بطور دینِ حق اختیار کرنے کا حکم نازل فرما دیا اور اعلان فرمایا کہ:۔

"اِنَّ الدِّینَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"

اور جس آخر الزمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دینِ حق کے مطابق زندگی گذار کر لوگوں کے سامنے ایک کامل نمونہ پیش کر دینے کا کام سپرد فرمایا تھا، آپ کی زندگی کے آخری ایام میں یہ اعلان بھی فرما دیا کہ:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ

آج کے دن میں نے ہر لحاظ سے تمہارے لئے "دینِ حق یعنی" کامل نظامِ زندگی کو مکمل حالت میں نازل کر دیا ہے اور اپنی اس عظیم نعمت کی تکمیل کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو واحد دین قرار دے کر راضی ہو گیا ہوں۔

اس طرح گویا "اسلام" ہی ایک دینِ فطرت ہے، جو انسان کے تمام فطری تقاضوں کو نہ صرف ملحوظ رکھتا ہے، بلکہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ان کو پورا کرنے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔

یہ "دینِ اسلام" اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لئے اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی نعمت بھی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں عطا کی گئی ہے۔

ہم مسلمان وہ خوش قسمت لوگ ہیں، جنہیں اللہ تعالےٰ نے اپنی یہ نعمت مسلمان ماں باپ کے گھروں میں پیدا فرما کر وراثت میں عطا فرما دی ہے۔ مگر ہم اس کی وہ قدر نہیں کر رہے ہیں جس قدر کی یہ نعمت مستحق ہے۔ اس نعمت کی ناقدری کرنے کی بنا پر ہی ہم آج ہر جگہ اور ہر ملک میں اطمینان و سکون اور خوشحالی سے محروم ہیں۔

اطمینانِ قلب کی راہ میں اسلامی نظامِ زندگی کا کردار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم اسلام کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کو ہی کیوں اختیار کریں، اس لئے ہمیں اسلامی نظامِ زندگی کی اُن خصوصیات کا جائزہ لینا ہوگا جو انسان کو "اطمینانِ قلب" سے ہم کنار کرنے کے لئے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

اسلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار اور اخلاق کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے اپنی دعوت کا آغاز "ایمانیات" سے کرتا ہے، اِن ایمانیات کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے بعد ہی وہ انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا کام کرتا ہے، پھر وہ انسان کے اندر خدا ترسی اور خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ ایسی ٹھوس محبت کے جذبات بیدار کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی زندگی میں اعمالِ صالحہ کی فصل لہلہانے لگتی ہے اور اس طرح انسان کے ذہن میں خدا کے سامنے جوابدہی اور خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے، جو اُسے خلوت اور جلوت میں خدا کی نافرمانی سے باز رکھتا ہے۔

یہ ایمان کیا ہے؟

پچھلے اوراق میں یہ بات تو واضح کی جا چکی ہے کہ انسانی جسم کے اندر ذہن (Mind) کو اس لحاظ سے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، کہ انسان کے سارے

اعمال و افعال اور خواہشات و جذبات کا سرچشمہ دراصل اس کا ذہن ہی ہوتا ہے، جب کسی انسان کے ذہن میں فاسد اور گندے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کی تمام حرکات و سکنات اور اعمال و افعال بھی غلط اور ناپسندیدہ ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی اصطلاح میں "ایمان" کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس یعنی ذہن میں ایسے عقائد و افکار اور ایسی باتوں کو راسخ کر لے جن کی صداقت اور حقانیت پر اُسے پختہ یقین ہو اور پھر ان عقائد کے خلاف اُس کے ذہن میں کسی اور بات یا خیال کے راہ پانے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اور اس کا نفس پوری طرح اُن باتوں پر مطمئن رہے۔

قرآن کی اصطلاح میں بھی انسانی سیرت و کردار کی اسی ذہنی بنیاد کا نام ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ مادہ اُمن سے نکلا ہے اور امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ ایمان کی اس حقیقت اور اہمیت کے پیش نظر اسلام نے ایمانیات کے شعور کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ایمانیات کا یہ شعور اپنے اندر ایسے فوائد رکھتا ہے جو کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے ممکن ہی نہیں ہیں۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(ضرب کلیم)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(اقبالؒ)

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

(اقبالؒ)

خُدا پر ایمان

اسلامی عقائد کی پہلی بنیادی چیز خدا پر ایمان یعنی ایمان باللہ ہے جو اسلام کے بنیادی کلمۂ توحید "لاالٰہ الا اللہ" پر مشتمل ہے، جس کی تشریح ہم اس کتاب کے دیباچہ میں پیش کر چکے ہیں، اس کو ملاحظہ فرمالیں اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ انسان جیسی اشرف المخلوقات کی عبادت کے لائق اور مسجود و معبود ہستی وہی ہو سکتی ہے۔

جو ہمیشہ زندہ و قائم ہو (حیّ و قیوم ہو)
صمد اور بے نیاز ہو۔ (اللہ الصمد)
قادرِ مطلق ہو (وَ ہُوَ علیٰ کلِ شیءٍ قدیر)
جس کا علم سب پر محیط ہو
جس کی رحمت سب پر وسیع ہو
جس کی طاقت سب پر غالب ہو
جس کی حکمت کامل ہو
جس کے عدل میں ظلم کا کوئی شائبہ نہ ہو،
جو زندگی بخشنے اور اس کو قائم رکھنے کی طاقت رکھتا ہو
جسے تھکاوٹ سے نیند اور اونگھ نہ آتی ہو۔
جو کسی لحہ کائنات کے انتظام سے غافل نہ ہو
جو ہر قسم کی کمزوریوں اور عیوب و نقائص سے پاک ہو

ظاہر ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کی ذات کے اس کائنات میں کوئی اور ایسی ہستی نہیں ہے جو ان صفات کی حامل ہو اس لئے اللہ تعالیٰ کی واحد ذات ہی عبادت اور بندگی کی مستحق ہے۔

میرا نشیمن نہیں درگاہِ امیر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
(علامہ اقبالؒ)

خدا کی ہستی اور مغربی مفکرین

خدا کی ہستی کا اقرار اور اس کی وحدانیت کا اعتقاد تمام الہامی مذاہب کا سنگِ بنیاد ہے۔ مذہب کے تفصیلی عقائد اور اس کی عملی صورتوں میں آج اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے درمیان چاہے کتنے اختلافات ہوں لیکن جہاں تک ہستئ باری کا تعلق ہے، اس پر یقین اور اس کی ذات واحد کو کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و فرمانروا تسلیم کرنے میں یہ تینوں متفق ہیں اس مشرب فلاسفہ اور متکلمین اور علمائے دینیات نے تو اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کا شمار و احاطہ بھی مشکل ہے۔ لیکن اب سائنس دان بھی اپنے علم، مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر خدا کی ہستی اور اس کی صفات کے متعلق علمائے دینیات کے نظریات و عقائد کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے ایک کتاب[۱] "خدا موجود ہے" مرتبہ "جان کلوور مونزما" کا ترجمہ شائع کیا تھا جس میں چالیس سائنسدانوں کے جو سائنس کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے ہیں کے ایسے مضامین جمع کئے ہیں — جن میں انہوں

---

[۱] "خدا موجود ہے" شائع کردہ مقبول اکیڈمی ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

نے اپنے اپنے علم و فن کے نقطۂ نظر سے خصوصیت کے ساتھ ہستی باری تعالیٰ کے مسئلے
پر باقاعدہ بحث کی ہے جو ایسے لوگوں کی تشفی کے لیئے بہت کافی ہے جو اپنے علم کی
کمی کی وجہ سے اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ خدا کو ماننا کوئی غیر سائنٹیفک بات ہے
پھر یہ سائنسدان اُن فلسفیوں کی طرح نہیں ہیں، جو خدا کو محض ایک قوت یا علت
اولیٰ (Firstcause) یا روح کائنات سمجھتے ہیں یا یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا اس
کارخانۂ ہستی کو ایک دفعہ حرکت دے دینے کی عقلی ضرورت پوری کر کے الگ ہو
بیٹھا ہو، بلکہ یہ سب سائنسدان الہامی مذاہب کے اس خدا کو مانتے ہیں اور عملی و عقلی
دلائل سے اس کی ہستی کا اثبات کرتے ہیں، جو ایک علیم و حکیم اور صاحب ارادہ شخصیت
ہے، جو صرف ایک دفعہ خلق کر کے نہیں رہ گیا، ہر آن تخلیقی عمل کر رہا ہے جو اس کائنات
کا محض خالق ہی نہیں، اس کا مدبر اور قیوم بھی ہے اور پھر اپنی خلق پر رؤف و رحیم بھی ہے
اللہ تعالےٰ کی ان صفات کے کھُلے کھُلے آثار و شواہد جو سائنس کے ہر شعبے میں نظر آتے
ہیں، انہیں بڑی خوبی کے ساتھ ان سائنسدانوں نے پیش کیا ہے اور نہایت معقول
طریقے سے بتایا ہے کہ یہ کام لامحالہ ایک صانع حکیم کے ہی ہو سکتے ہیں، جو علیم و خبیر
اور سمیع و بصیر ہو، جس نے بہ ارادہ ایک منصوبے اور مقصد کے مطابق کائنات کا یہ
نظام بنایا ہو اور جسے محض پیدا کرنے سے ہی دلچسپی نہ ہو، بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کی حاجات
و ضروریات پوری کرنے کی بھی فکر ہو۔

پرانے مادہ پرستوں کا سارا زور اس دعوے پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا، اس کی
صرف صورت بدلی جا سکتی ہے۔ مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس
کی مقدار میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عالم مادی کی ابتدا
اور انتہا نہیں ہے، مگر اب جوہری توانائی (Atomicenergy) نے اس

پورے تخیل کی بساط الٹ دی ہے۔ اب مادہ قوت میں تبدیل ہوتا ہے اور قوت مادے میں۔ ان سائنسدانوں کے نزدیک اب حرکیات حرارت (THERMO-DYMAMICS) کے دوسرے قانون نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ مادی عالم نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی، اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے۔ ماہر طبیعات جارج ارل ڈیوس اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ اگر کائنات از خود پیدا ہو سکتی ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تخلیق کی قوت سے بھی متصف ہے۔ جسے ہم خدا کی قوت قرار دیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں گویا ہم اس کائنات ہی کو خدا قرار دے دیں گے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کرلیں گے، لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کی بجائے، ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں، جس نے ایک عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس کا وہ خود کوئی جزو نہیں ہے بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم اور مدبّر ہے۔

فرشتوں پر ایمان

ایمان کی دوسری بنیاد خدا کے فرشتوں پر ایمان لانا ہے۔ یہ فرشتے اللہ تعالےٰ کی ایک غیر مرئی (نہ نظر آنے والی) مخلوق ہے جو ہر وقت اللہ تعالےٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کرنے میں مصروف رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کائنات کا انتظام اسی مخلوق کے ذریعہ چلا رہے ہیں۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم اُنہیں ملتا ہے اس کی فوراً تعمیل کرتے ہیں اور احکامِ خداوندی کو آناً فاناً نافذ کر دیتے ہیں۔ بعض مشہور فرشتے بعض خاص کام سرانجام دینے پر مامور ہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام

خدا کا پیغام اور خدا کا کلام خدا کے پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں۔

حضرت عزرائیل علیہ السلام

جب بھی کسی انسان کی خدا کی طرف سے مقرر کردہ عمر کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو یہ بلا تاخیر اس کی جان قبض کر لینے کا انتظام کرتے ہیں۔

حضرت اسرافیل علیہ السلام

ہماری اس دنیا کے اس حالت میں قائم رہنے کی بھی ایک مدت مقرر ہے جب یہ مدت ختم ہو جائے گی، تو حضرت اسرافیل علیہ السلام جو اپنے منہ میں ایک قرنا (صور) لئے کھڑے ہیں۔ اس میں پہلی پھونک ماریں گے جس کی خوفناک آواز سے اس ساری دنیا اور زمین و آسمان چاند سورج اور ستاروں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ساری مخلوق پر موت طاری ہو جائے گی۔

خدا کے پیغمبروں پر ایمان

ایمان بالرسالت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے رسول اور نبی بھیجے، وہ سب خدا کے سچے پیغمبر تھے، جن پیغمبروں کے نام اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بتلا دیئے ہیں اُن سب پر ان کا نام لے کر ایمان لانا ضروری ہے اور جن پیغمبروں کے نام نہیں بتائے گئے ہیں، اُن پر اجمالاً اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ بھی خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ قرآن پاک نے جن نبیوں اور رسولوں کے نام بتائے ہیں، اُن کے علاوہ کسی اور کا نام نبیوں کی اس فہرست میں داخل کر کے ایمان لانا، یا اُن بتلائے گئے ناموں والے پیغمبروں میں سے کسی کا انکار کرنا یا اس فہرست میں بطور خود کسی اور نبی کے

نام کا اضافہ کر کے اس پر ایمان لانا، عقیدہ ایمان بالرسالت کے خلاف ہوگا۔ اور اُن ناموں میں کمی یا بیشی کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج قرار پائے گا، یہودی عیسائی اور قادیانی اسی کمی بیشی کی بناء پر دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

ایمان بالکتب

ایمان بالکتب کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی، تمام کتابوں پر ایمان لایا جائے کہ وہ اللہ کی سچی کتابیں ہیں۔ اسلام ان تمام کتابوں کو سچا ماننے کا حکم دیتا ہے، جو بھی اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی تھیں اور جن کتابوں کے نام قرآن پاک نے بتا دیئے ہیں اُن سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور باقی صحیفوں پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے۔ تورات، اور زبور اور انجیل خدا کی نازل کردہ سچی کتابیں تھیں مگر بعد میں ان کے الفاظ اور مضامین بدل دیئے گئے اور یہ کتابیں اپنے اصلی الفاظ میں محفوظ نہ رہیں، اُن کے بعد آخرالزمان پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی آخری کتاب "قرآن پاک" نازل کی گئی اور آج قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں ہے اور اب قیامت تک کے انسانوں کی راہنمائی کے لئے یہی قرآن ایک جامع اور مکمل کتاب الٰہی ہے۔ جس کی پیروی کرنا قیامت تک تمام انسانوں پر لازم قرار دیا گیا ہے کیوں کہ قرآن پاک خدا کی طرف سے نازل کردہ پہلی تمام کتابوں کی تعلیمات کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

قیامت پر ایمان

ایمان کی پانچویں بنیاد "ایمان بالآخرۃ" ہے، آخرت سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ ہمارا اس بات پر ایمان ویقین ہونا چاہیئے کہ

اس کائنات کا نظام ایک دن درہم برہم کر دیا جائے گا، یہ زمین، یہ آسمان

یہ سورج، چاند، ستارے آپس میں ٹکرا جائیں گے اور تمام زندہ چیزوں پر موت طاری ہو جائے گی۔

پھر اللہ تعالیٰ اس زمین کو ہموار کر کے ایک بڑے میدان کی صورت دے دیں گے۔

پھر اس میدان حشر میں تمام مخلوق کو دوبارہ زندہ کر کے حساب و کتاب کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس حساب و کتاب میں جن خوش بخت لوگوں کا نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو گا، اُن کو جنت کے باغات میں داخل کیا جائے گا اور جن لوگوں کا برائیوں اور گناہوں کا پلڑا بھاری ہو گا، ان کو جہنم کی سزا دی جائے گی (نعوذ باللہ)

ایمان کی یہ پانچ بنیادیں ہم نے بطور یاد دہانی پیش کر دی ہیں تاکہ "اطمینانِ قلب" کے متلاشی حضرات اِن ایمانیات کو اپنے ذہنوں میں تازہ رکھیں، اب ہم ان ایمانیات کے وہ فوائد بیان کریں گے جو انسان کو اطمینانِ قلب سے سرشار رکھتے ہیں۔

ایمان کے فوائد

یہ ایمانیات اپنے اندر ایسے غیر معمولی فوائد رکھتے ہیں، جو کسی بھی اور اعتقاد یا نظریے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

خدا کی ذات اور صفات پر ایمان لانے سے انسان کے نفس میں کچھ عجیب و غریب صفات پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی وجہ سے اُس کے دل میں ایک اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

پہلا فائدہ

خودداری و عزتِ نفس

خدا پر سچا ایمان لانے اور اس کی عظمت کو پہچان لینے کی کیفیت، انسان کو یکایک پستی اور ذلت سے اٹھا کر خودداری اور عزتِ نفس کے بلند ترین مدارج تک پہنچا دیتی ہے، جب تک اُس نے اپنے خدا کو نہ پہچانا تھا، وہ دنیا کی ہر طاقت ور چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز، ہر اس چیز سے جو اس کو بظاہر نفع و نقصان پہنچانے والی نظر آتی تھی، اُس سے ڈرتا تھا، اس کے آگے جھک جاتا تھا، اس کے آگے اپنے ہاتھ پھیلا دیتا تھا، اس سے امیدیں وابستہ کرنے لگتا تھا۔ مگر ایک خدا پر ایمان لانے سے اُسے معلوم ہو گیا کہ جن کے آگے وہ اپنے ہاتھ پھیلا رہا تھا، جن کے آگے جھک رہا تھا وہ تو خود محتاج ہیں، جن کی وہ بندگی یا پوجا پاٹ کر رہا تھا، وہ تو خود خدا کے بندے اور بے بس ہیں، جن سے اس نے امیدیں باندھ رکھی تھیں، وہ خود اپنی مدد کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے ہیں بلکہ خود خدا کے سامنے مجبور ہیں، زمین و آسمان کے رزق کی کنجیاں صرف خدا کے پاس ہیں، اس لئے رزق دینے والا، مارنے اور زندہ کرنے والا لڑکے اور لڑکیاں دینے والا وہی اکیلا خدا ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد انسان تمام دنیا کی طاقتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے، پھر خدا کے سوا اس کی گردن کسی کے آگے نہیں جھکتی، خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلتا، خدا کو چھوڑ کر وہ کسی بھی دوسرے سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتا۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں، کہ جس شخص کا ذہن اس قسم کے جذبات اور خیالات کو اپنا لے اُس کے اندر کیسی عزتِ نفس اور خودداری پیدا ہو جاتی ہوگی، وہ اپنے آپ کو کیسا معزز اور آزاد سمجھنے لگتا ہوگا اور

اس کا دل کتنا پُر سکون اور ہر چیز سے بے خوف ہوگا ؎

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی | یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی | شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

(بالِ جبریل، علامہ اقبال)

دُوسرا فائدہ

مایوسی اور شکستہ دلی کا خاتمہ

یہ خدا پر ایمان انسان کے اندر رجائیت یعنی ہمیشہ پُر امید رہنے کی ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں بھی انسان کو مایوس اور شکستہ دل یعنی مایوسی اور شکستہ دل نہیں ہونے دیتی، ایک مومن کے لئے یہ ایمان ایک ایسا لازوال خزانہ ہے جس سے اس کے دل کو قوت اور روح کو تسکین کی دائمی اور لازوال رسد پہنچتی رہتی ہے، چاہے وہ دُنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے سارے دنیوی اسباب کا رشتہ بھی ٹوٹ جائے، دنیا کے سارے وسائل اور ذرائع ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیں، مگر اس خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا اور اسی کے سہارے وہ ہمیشہ پُر امید رہتا ہے، کیوں کہ وہ جس خدا پر ایمان لے آیا ہے وہ خدا اُسے بار بار یقین دلاتا ہے۔

"میں تمہارے قریب ہی ہوں اور تمہاری ہر پکار کو سُنتا ہوں۔"

"وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" (سورہ بقرہ - ۲۳)

"مجھ سے ظلم اور بے انصافی کا خوف نہ کرو کہ میں ظالم نہیں ہوں۔"

"وَاَنَّ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" (سورہ آلِ عمران ۱۹)

"میری رحمت سے مایوس تو وہ ہوتے ہیں، جو مجھ پر ایمان نہیں رکھتے۔"

"اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ" (سورہ یوسف ۱۰)

"رہا مومن! تو اس کے لئے مایوسی ناامیدی کا کوئی مقام نہیں ہے، اور اگر اُس نے کوئی گناہ یا قصور کیا ہو، تو وہ مجھ سے معافی مانگ لے، میں اس کو معاف کر دوں گا۔"

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (سورہ النساء ۱۴)

"اگر دنیا کے اسباب اس کا ساتھ نہیں دیتے، تو وہ ان پر بھروسہ چھوڑ کر میرا دامن تھام لے، تو پھر خوف وغم اس کے قریب بھی نہ پھٹکے گا، جو اس کے سکون و اطمینان کو تلپٹ کر دیتے ہیں۔"

"اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ...... (سورہ حم سجدہ ۴)

تیسرا فائدہ

توکل بر خدا انسان کی یہی پُر امید رہنے کی کیفیت جب ترقی کرتی ہے تو انسان کے اندر صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، جو مومن کے دل کو ایک چٹان کی طرح مضبوط اور مستحکم کر دیتے ہیں اور جب وہ حق و صداقت کے راستہ میں ڈٹ جانے کا عزم کر لیتا ہے تو ساری دنیا کی مشکلات دشمنیاں، تکلیفیں اور مخالفتیں مل کر بھی اس کے قدم اکھاڑ نہیں سکتیں۔

توکل اور ایمان کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں

ایمان اور توکل کے متعلق ایک ساتھ حکم دیا ہے کہ اگر تم مسلمان ہو اور اللہ پر ایمان لائے ہو تو اللہ پر توکل بھی کرو (وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝)

(سورۂ مائدہ ۲۳)

یہ ہو نہیں سکتا کہ ہمارے رب معبود، رازق اور مالک تو اللہ تعالیٰ ہوں اور ہم توکل کسی اور پر کریں۔ توکل دراصل ایمان کا ہی ثمرہ ہوتا ہے اور دل کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے خدا پر بھروسہ سے دل میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے اور انسان مایوسی، اضطراب اور خوف سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ عقیدۂ توحید اور توکل سے انسان کے دل میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے دل کو کشادہ کر دیتا ہے اور اس کے انقباض کی کیفیت کو دور کر دیتا ہے۔

یہی توکل انسان کے دل سے تفکرات کو دور کر کے اطمینان و سرور پیدا کر دیتا ہے اور اس کے حوصلوں کو بلند رکھتا ہے اور جس قدر انسان کا یہ توکل کامل ہوتا ہے اسی قدر اُسے اطمینانِ قلب حاصل رہتا ہے۔ ہماری نگاہ چونکہ محض ظاہری اسباب پر ہوتی ہے، جو عموماً ہم خود اختیار کرتے ہیں اور ہماری ہی کوشش سے پیدا ہوتے ہیں، پوشیدہ اسباب پر ہماری نگاہ نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ہمارے خیال و گمان سے باہر ہوتے ہیں اس لئے اگر ظاہری اسباب ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں تو ہم خوش ہو جاتے ہیں اور اگر وہ میّسر نہ ہوں تو ہم مایوس ہونے لگتے ہیں حالانکہ ہماری زندگی میں کامیابی اور رزق اکثر مخفی اسباب سے حاصل ہوتا ہے۔

ہمارا بھروسہ چونکہ محض ظاہری اسباب پر ہوتا ہے اور پوشیدہ اسباب اور اللہ تعالیٰ کی وہ تدبیریں ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہیں ان پر ہمارا ایمان

کمزور ہوتا ہے، اس لئے ہم پریشان ہو جاتے ہیں، حالانکہ ہمیں اللہ پر پورا بھروسہ اور توکل رکھنا چاہیئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمیں ظاہری اور باطنی دونوں اسباب مہیا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی بظاہر غیر موثر تدابیر کو موثر بنا دیتے ہیں۔ یہ توکل کی کیفیت ہمیں بہت سی بے جا پریشانیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

چوتھا فائدہ

شجاعت و بہادری

یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان انسان کے اندر ایک غیر معمولی حرارت و شجاعت، دلیری اور بہادری کی کیفیات بھی پیدا کر دیتا ہے، کیوں کہ ایمان باللہ کی وجہ سے انسان کا تعلق ایک ایسی ہستی سے جڑ جاتا ہے، جس کی قدرت ہر چیز پر غالب ہے، جو بڑی طاقتور اور دبدبے کا مالک ہے، جس کے اذن اور اجازت کے بغیر دنیا کی کوئی چیز یا مخلوق بھی اُسے نقصان یا فائدہ نہیں پہنچا سکتی ہے اور زمین و آسمان کی ساری چیزیں طوعاً و کرہاً اس خدا کے آگے جھکی ہوئی ہیں اور زمین و آسمان کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، تمام انسانوں کی پیشانی کے بال اس کی مٹھی میں ہیں، وہی بہترین مددگار اور کارساز ہے، وہی صاحبِ امر و حاکم بھی ہے۔ وہ اپنے تمام بندوں پر غالب ہے۔

آج ہم میں سے کسی کا تعلق ایک سپاہی، ایک تھانیدار، ایک تحصیلدار، ایک مجسٹریٹ یا کسی حاکم اور بڑے آدمی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ پھولا نہیں سماتا اور اس کے اندر ایک اعتماد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُسے جب کوئی مصیبت پڑے گی تو وہ اس کی مدد حاصل کرے گا تو اس شخص کے مقابلے میں ذرا اس مومن

کی شجاعت، بہادری، دلیری اور اعتماد کا اندازہ لگائیں جس کا تعلق خداوند تعالیٰ کی اس عظیم ہستی کے ساتھ جڑ گیا ہے جس کی مرضی کے بغیر کسی درخت کا کوئی پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا ہے

دو چیزیں انسان کو بزدل بناتی ہیں، ایک محبت جو وہ اپنی جان، اپنے اہل و عیال، اپنے کاروبار، اپنے مال اپنی جائداد اور زمین کے ساتھ رکھتا ہے اور دوسرا خوف جو اس کے اس خیال کا نتیجہ ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت اور مرضی کے بغیر بھی اسے دُنیا کی کوئی چیز نقصان پہنچا سکتی ہے یا اُسے ہلاک کر سکتی ہے۔

محبت کے معاملہ میں بھی خدا پر ایمان اُس کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر دیتا ہے، اُسے یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ خدا کی ذات ہی دوسری سب چیزوں کے مقابلہ میں محبت کی زیادہ مستحق ہے۔ مال و اولاد تو دنیا کی زینت کے اسباب ہیں جن کا کسی نہ کسی وقت ضائع ہو جانا یقینی ہے، کبھی نہ ضائع ہونے والی چیز اُسے اپنے خدا کے ہاں ہی مل سکتی ہے۔ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اس کو ہم بچانے کی لاکھ کوشش کریں، موت بہر حال آ کر رہے گی، اس لئے اس کی حقیقی محبت کے قابل یہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ خدا ہے جو اُسے ان چیزوں کے بدلے کہیں بہتر انعامات بھی دے سکتا ہے اور اس زندگی سے بہتر زندگی بھی عطا کر سکتا ہے اس لئے اُسے محبت صرف خدا سے کرنی چاہیئے۔

"وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" (سورہ البقرہ ۲۰) اور ایمان والے تو اللہ کے ساتھ ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

انسان کو بزدل بنانے والی دوسری چیز خوف ہے، جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُسے نقصان پہنچانے یا ہلاک کر دینے کی قوت اُس جیسے انسانوں یا حیوانات یا لکڑی اور پتھر اور دوسرے اسلحہ جات میں پائی جاتی ہے تو وہ اُن سے خوف کھانے

لگتا ہے، مگر جب خدا پر ایمان کے ذریعہ اُسے یہ باور کرادیا جاتا ہے کہ اُسے نقصان پہنچانے یا اُسے ہلاک کر دینے کی قوت فی نفسہٖ ان چیزوں میں نہیں ہے، بلکہ خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور تمام دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اُسے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کی مرضی نہ ہو تو اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں۔

وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ-۱۰۲)

کسی کی موت کا وقت خدا نے جو لکھ دیا ہے اُس سے پہلے کسی اور کے لائے موت نہیں آسکتی ہے۔ "وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا" (سورہ آلِ عمران ۱۴۵) اور اگر کسی کی موت کا وقت آن پہنچے تو پھر وہ کسی کے ٹالے ٹل بھی نہیں سکتی۔" قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ (سورۂ آلِ عمران ۱۵۴)

یہ عقیدے انسان کے اندر ایسی دلیری اور بے خوفی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے خطرناک حالات میں بھی پریشان نہیں ہوتا۔

پانچواں فائدہ

قناعت و استغنا

یہی ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص و ہوس اور بغض و حسد کے گھٹیا جذبات کو نکال باہر کرتا ہے جو اُسے دنیوی فوائد کے حصول کے لئے جائز و ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر اکساتے رہتے ہیں اور انسانوں کے درمیان باہمی جھگڑے اور فساد کا باعث بنتے رہتے ہیں۔ خدا پر ایمان کی وجہ سے انسان کے دل میں کمال درجے کی قناعت پیدا ہو جاتی ہے، جو دوسرے سے جھگڑا و فساد کرنے سے باز رکھتی ہے۔ انسان ہمیشہ

باعزت اور باوقار طریقہ سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا رہتا ہے اور جو تھوڑا بہت رزق بھی اُسے مل جاتا ہے اُسے خدا کی عنایت سمجھ کر اس پر قناعت کر لیتا ہے۔

مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ فضیلت و شرف (رزق کی فراخی اور عزت) اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ہ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط

(سورہ آل عمران ۸)

رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو جتنا چاہے عطا کرتا ہے۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ (سورہ الرعد۔ ۳)

حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے حکمران بنا دے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُہَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (سورہ الاعراف ۱۵)

عزت اور دولت اس کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے عزت دے دے، جس کو چاہے ذلیل کر دے۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورہ آلِ عمران ۳)

آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان، رنگ و نسل برادریوں اور قبائل، عزت اور دولت، حُسن اور طاقت، مال و جائداد رزق کے مراتب کے اعتبار سے کوئی گھٹا ہوا ہے کوئی بڑھا ہوا ہے تو یہ دراصل خدا کا ہی قائم کردہ نظام ہے اور خدا اپنی مصلحتوں کو خود ہی بہتر سمجھتا ہے، ہم اس کے اس نظام کو بدل کر مساوات قائم کرنا چاہیں بھی تو قائم نہیں کر سکتے، اس لئے ہمارا اطمینان اسی

میں ہے کہ دنیا میں اپنے حصّہ کے رزق اور حاصل شدہ مرتبہ پر خوش رہیں اور دوسروں کے مال وجاہ سے استغنا برتیں۔ ہمارا ایمان ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے ہاں وہ ہمیں جائز حدود کے اندر اپنی کوششیں جاری رکھنے کا بھی ساتھ ساتھ حکم دیتا ہے کہ انسان رزق کی تلاش میں ہاتھ توڑ کر بیٹھ نہ جائے بلکہ تگ و دو کرتا رہے۔

یہی ایمان باللہ مندرجہ بالا شاندار جذبات کے ساتھ ساتھ انسان میں تسلیم و رضا اور اطاعت و انقیاد کے ایسے جذبات بھی پیدا کر دیتا ہے، جن کی بنا پر وہ خدا کے ہر حکم کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے، اس کی عبادت و پرستش میں لذت محسوس کرتا ہے، اس کے احکام کی بجا آوری کو اپنا شرف سمجھتا ہے اور اس کی بے شمار نعمتوں کا خیال کرتے ہوئے اس کے آگے بچھ بچھ جاتا ہے۔ اور پکار اٹھتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اِنِّیْ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اپنی پسندیدہ اعمال و اخلاق کی بنا پر وہ اپنی سوسائٹی میں معزز اور بزرگ شمار ہونے لگتا ہے ؎

ہے جاہ میں تسکین نہ حشمت میں سکون ہے
ہے عیش میں آرام نہ عشرت میں سکون ہے
ملتی ہے فقط نامِ خدا سے راحت
ملتا فقط حق کی عبادت میں سکوں ہے

اطمینانِ قلب میں ایمان بالآخرت کا حصّہ

ایمان باللہ کی تشریح میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ کا شعور ہمارے ذہن کو کس طرح اطمینان سے معمور کرتا ہے۔ اسی طرح اب ہم بتائیں گے کہ ایمان

بالآخرۃ کے عقیدہ کا ہمارے اطمینانِ قلب کے ساتھ کیسا گہرا تعلق ہے۔ غور کیجئے کہ ہمارے گرد و پیش آئے دن ایسے بے شمار واقعات و حادثات پیش آتے رہتے ہیں، جن میں ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں، اپنے بزرگوں اور اپنے ہم وطنوں کو موت سے ہمکنار ہوتے دیکھتے ہیں، ہم میں سے بے کس اور مزدور بھی مرتے ہیں، بادشاہ اور شہنشاہ بھی مرتے ہیں، رئیس اور امیر بھی مرتے ہیں، طاقت اور دبدبہ رکھنے والے بھی مرتے ہیں، کئی حسرت ناک اور عبرت ناک اموات اور واقعات بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی ہر انسان کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ

یہ موت آخر کیوں آتی ہے؟

انسان اس موت کے دروازہ سے گذر کر کہاں جاتا ہے؟

موت کے بعد انسان کو کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔؟

اسلام نے اس اُخروی زندگی کے متعلق ہمیں جو عقیدہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً ایک عمر رکھتی ہے، جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد و بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے، جس کے ختم ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور ایک دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے گا۔ جس کے قوانین موجودہ قوانین سے مختلف ہوں گے۔

اس نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی عدالت قائم فرمائیں گے جس میں ہر چھوٹی بڑی چیز کا حساب لیا جائے گا، انسان کو دوبارہ زندہ کر کے ایک نئی جسمانی زندگی دی جائے گی اور وہ اپنے خدا کے سامنے جواب دہی کے لئے حاضر ہو جائے گا، اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے، ٹھیک

ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے، حق و انصاف کے ساتھ اس کے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ دیا جائے گا اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔

انسان کی موجودہ زندگی ایک عارضی زندگی ہے اور یہ دنیا دارالامتحان ہے اور دارالآزمائش تو ہے مگر دارالجزا نہیں ہے کہ یہاں پر انسان کو اس کے اچھے اعمال برے اعمال کا صحیح بدلا مل سکے، اس لئے اس اُخروی زندگی میں اس کے پورے اعمال نامہ کا حساب چکا دیا جائے گا۔ اور یہ اُخروی زندگی نہ ختم ہونے والی زندگی ہوگی، اچھے اعمال والے ہمیشہ جنّت میں رہیں گے، جہاں پر اُن کو حسبِ مراتب بہترین نعمتیں دی جائیں گی اور بُرے اعمال والے دوزخ کی آگ کے حوالے کئے جائیں گے جس میں ان کو ہمیشہ سزا بھگتنی پڑے گی۔ (نعوذ باللہ)

ایمان بالآخرۃ کا یہ عقیدہ ہر اس انسان کے دل کو یقیناً اطمینان سے معمور کر دیتا ہے، جس نے بھی اپنی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا مندی کا حصول قرار دے رکھا ہو اور وہ اپنی خواہشات و جذبات اور مرغوبات پر کنٹرول کر کے پرہیزگاری کی زندگی بسر کر رہا ہو اور اس نے تجارت، ملازمت، معاملات اور دوسرے معمولاتِ زندگی میں خدا خوفی کا طرزِ عمل اپنا رکھا ہو۔

ایمان بالآخرۃ کا یہ عقیدہ ایسے اشخاص کو یہ اطمینان فراہم کر دیتا ہے کہ اس پرہیزگارانہ زندگی کی وجہ سے اگر بظاہر کچھ دنیوی اسباب و ذرائع میں، خدا سے بے خوف لوگوں کی نسبت کچھ پیچھے ہی رہ گیا ہو تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی پوری تلافی فرما دیں گے، بلکہ اُسے ایسے مزید انعامات سے بھی نوازیں گے جن سے اُسے ایسی خوشیاں ملیں گی جن کا اس دنیوی زندگی میں وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا ہے۔

حُبِ عاجلہ کی حقیقت

انسان کے دل میں چونکہ حُبِ عاجلہ یعنی جلد حاصل ہونے والے منافع سے محبت کی ایک بھاری پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے عام طور پر وہ جلدی میں مل جانے والے ایک روپیہ کو دیر سے ملنے والی ایک اشرفی پر ترجیح دینے لگتا ہے، اس لئے

قرآن پاک نے ایمان والوں کے دلوں میں طمانیت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے بے شمار تاریخی واقعات اور شواہد پیش کئے ہیں۔ سورۂ قصص میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار "قارون" کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا فرد تھا، مگر وہ اپنی قوم سے غداری کر کے اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر کے قبطی بادشاہ فرعون کے ساتھ مل گیا تھا اور اس بادشاہ کا درباری بن کر اس نے بے پناہ دولت سمیٹ لی تھی، جس کے خزانوں کی چابیاں کئی اونٹوں پر لادی جاتی تھیں اور اس نے اتنا سونا اکٹھا کر رکھا تھا کہ ایک شاعر نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج ہمیں اپنے باغات میں زرد رنگ کے جو پھول نظر آتے ہیں یہ قارون کے اس سونے کا رنگ لئے ہوئے ہیں جس کو زمین میں غرق کر دیا گیا تھا۔ یہ قارون اپنے زمانہ میں جب اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بازار میں خریداری (Shopping) کے لئے نکلا کرتا تھا، اس وقت کے مادہ پرست لوگوں کے تاثرات کو قرآن پاک نے یوں نقل فرمایا ہے۔

" قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (سورہ القصص ۸۰)

" جو لوگ دنیوی زندگی کے فائدہ کو ہی چاہتے تھے، انھوں نے کہا کہ کاش

ہم کو بھی وہی ملتا ہے جو قارون کو دیا گیا ہے، وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح علم دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگوں پر افسوس! اللہ تعالیٰ کا ثواب اُس شخص کے لیئے کیسا اچھا ہے، جو ایمان لایا ہے اور جس نے نیک اعمال کیئے، چاہے وہ دنیا کے خزانوں کے حصول میں دوسروں سے پیچھے ہی کیوں نہ رہ گیا"

پھر ایک اور جگہ پر نہایت واضح اور دو ٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے۔

"لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَھَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِھَادُ ۝ لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (سورہ آلِ عمران ۱۹۸)

اے نبیؐ۔ دنیا کے شہروں یا ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا لطف ہے، پھر سب جہنم میں جائیں گے، جو بدترین جگہ ہے، ان لوگوں کے برعکس جو اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کے لئے ایسے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ ان کے لئے سامانِ ضیافت ہوگا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے۔

غیر مطمئن لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ

آخرت کی زندگی کے اس عقیدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے

اس عقیدہ کے منکرین کی طرف سے پیش کئے جانے والے اعتراضات اور شکوک کے ایک ایک کانٹے کو صاف کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

"وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں گم ہوجائیں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا ہوں گے" (سورۃ السجدہ-۱)

"جب گل سڑ کر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے"؟ (سورہ بنی اسرائیل ۵)

"کون ہے جو ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب وہ بوسیدہ ہوچکی ہوں گی۔

ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ (جسے ہم نے ایسے غیر مرئی ستونوں پر کھڑا کر رکھا ہے، جو تمہیں نظر نہیں آتے) خدا نے تو ایسی بڑی چیز کو بنا ڈالا (سورہ الرعد-۱ سورۃ النازعات ۲)

بلاشبہ انسان پر ایک ایسا وقت گذر چکا ہے۔ جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا (جب ہم نے اس وقت تمہیں پیدا کر دیا تو اب کیوں نہ پیدا کر لیں گے (سورہ الدھر-۱)

تم مُردہ تھے تو خدا نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہ تم کو مردہ کرے گا اور پھر زندہ کرے گا، پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (البقرہ-۳)

اس نے کہا "کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوجائیں گی۔ کہہ دیجئے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا، جس نے ان کو پہلی بار زندگی بخشی تھی"!

ان سے کہو، تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا اور کوئی ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے

نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو، پھر وہ پوچھیں کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا تو کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا تھا (سورہ بنی اسرائیل - ۵)

"اور وہی تو ہے جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے آسان تر ہے۔ (سورہ الروم - ۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حدیث پاک میں ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ جس نے اپنی لاش کو جلا کر منتشر کر دینے کی وصیت کی تھی۔

حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم سے پہلے گذری ہوئی امتوں میں سے ایک شخص ایسا تھا، جسے اپنی بد اعمالیوں کی بناء پر گمان تھا کہ اگر اللہ رب العالمین نے اس پر قدرت پالی تو اُسے دنیا والوں سے بڑھ کر عذاب دے گا، اس لئے اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے پکڑ لو اور میری لاش کو جلا کر کوئلہ بنا دو، پھر اس کو پیس ڈالو اور ایک ایسے دن جب کہ تیز گرم ہوا (آندھی) چل رہی ہو، میری آدھی راکھ کو سمندر میں اور آدھی راکھ کو خشکی میں منتشر کر ڈالنا (کہ شاید اس طرح میں خدا کی پکڑ سے بچ جاؤں) چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایسا ہی کیا اللہ تعالیٰ نے پھر بھی اس کے تمام اجزاء کو جمع کر لیا۔" ایک روایت میں ہے کہ اس نے وفات سے پہلے اپنے بچوں کو جمع کر کے اپنے متعلق پوچھا کہ میں کس قسم کا باپ تھا تو انہوں نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ آپ نے ہمارے حق میں، جو بھلائی ممکن تھی وہ کی اور کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، اس کے ساتھ ہی اس شخص نے یہ کہا، لیکن میں نے اللہ کے پاس پیشی کے لئے کوئی بھلائی نہیں کی اگر میں اللہ کے حضور پیش ہو گیا تو مجھے عذاب دے گا۔ اس کی یہ تدبیر بھی اُسے

خدا کے سامنے حاضر ہونے سے بچا نہ سکی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے تمام منتشر اجزاء کو جمع کرلیا۔

جب اُخروی زندگی کے متعلق انسان کا ذہن اس طرح مطمئن ہو جاتا ہے تو اس کو زندگی میں ایک یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اور ایمانیات کے ان تصورات کے مطابق اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نکھار پیدا ہو جاتا ہے جس میں سکون و اطمینان کے سوا کوئی چیز پنپ نہیں سکتی۔

اسلامی نظامِ زندگی کی خوشگوار ترتیب

اللہ تعالیٰ نے انسان کو چونکہ بہترین ساخت پر پیدا فرمایا تھا اور دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اس کو بہترین صفات بھی عطا فرمائی تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو بہترین سیرت و کردار اور اخلاق سے آراستہ کرے اور دنیا کی نعمتوں کو باوقار طریقہ سے استعمال میں لائے، تاکہ فرشتوں اور جنّات پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ انسان واقعی اشرف المخلوقات ہے اور وہ دنیا میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کی بجائے اس کی اصلاح کا کام بھی کر سکتا ہے اور انسانیت کے ایسے نمونے بھی پیش کر سکتا ہے، جن پر فرشتے بھی عش عش کر اٹھیں، اسی غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے زندگی کے معاملہ میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑ دیا تھا، بلکہ اس کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے پے در پے پیغمبر بھیجے۔ اور آخرالزمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو وہ دینِ حق یا نظامِ زندگی دیا، جس کے پیروکاروں نے زندگی کے ہر شعبہ میں سنگ میل گاڑ دیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے پاکیزہ سیرت و کردار کے ان صحابہ کرام کی ایک جماعت منظم کر کے ایک اسلامی ریاست بھی قائم کر دی تاکہ لوگوں کے لئے حق کے راستہ پر چلنا آسان ہو جائے اور باطل راستوں پر جانا مشکل ہو جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثالی اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے لئے ایک فطری ترتیب استعمال فرمائی اور اُسے نہایت ٹھوس بنیادوں پر قائم فرمادیا۔

پہلا قدم

آپ نے پہلے قدم کے طور پر سب سے زیادہ اہمیت "ایمانیات" کو دی اور اسی ایمان کی دعوت سے اپنے کام کا آغاز فرمایا اور انسانی ذہنوں سے فاسد اور گندے خیالات، غلط افکار کو صاف کر کے ان کی جگہ پاکیزہ خیالات اور صحیح افکار و خیالات پر مبنی ایمانیات راسخ کئے۔ جن کو آج مسلمانوں میں کام کرنے والی مختلف مذہبی اور سیاسی جماعتیں نظر انداز کر دیتی ہیں اور مسلمانوں میں ایمان کا شعور پیدا کرنے کو وہ اہمیت نہیں دیتیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کی ابتداء میں دی تھی اور جس کی بدولت ہی ۳۱۳ صحابہ نے میدانِ بدر میں قریشِ مکہ کی عظیم طاقت کا زور توڑ کر رکھ دیا تھا اور اُن کو شکستِ فاش دے دی تھی۔

ان ایمانیات کا تذکرہ ہم پچھلے باب میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔

دوسرا قدم

جب آپ نے ایمان کی یہ بنیادیں اپنے مخاطبین کے ذہنوں میں راسخ فرمالیں تو دوسرے قدم کے طور پر ان کو ایک تدریج کے ساتھ اسلامی احکام کی اطاعت کی طرف دعوت دی، ان ایمانیات کی برکت سے پھر ایمان والوں کو بھی اسلامی احکام کی پابندی کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ ان کے ذہن خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے

پہلے ہی تیار ہو چکے ہیں۔

کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھنے کے بعد جب وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور ان کے سامنے دن بھر میں پانچ نمازوں کی ادائیگی کا حکم رکھا گیا تو انہوں نے اس پر کوئی انقباض محسوس کرنے کی بجائے خندہ پیشانی سے اس لئے قبول کر لیا کہ جس خدا کی عبادت کا یہ حکم اُن کو دیا گیا تھا، اس خدا کی اطاعت میں اس کائنات کی ساری چیزیں، زمین، سورج، چاند، ستارے، آسمان، پانی، ہوا، آگ، شجر و حجر لگے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جن بے شمار نعمتوں سے یہ انسان فائدہ اٹھا رہے تھے اُن کے مقابلہ میں یہ پانچ وقت کی نمازیں کسی طرح بھی بھاری نہ تھیں، بلکہ یہ ایک ایسی سعادت تھی جس میں دنیا اور آخرت کے بے شمار فوائد پوشیدہ تھے، نماز کی ادائیگی سے انسان کے اندر صفائی طہارت اور پاکیزگی کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ خدا کی نافرمانی اور بے حیائی کے کاموں سے نفرت پیدا ہوتی تھی، نماز کی حالت میں خدا سے ہمکلام ہونے سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی تھی۔ خدا کا بندہ وغلام ہونے کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ دنیا کے کاموں میں مصروفیت کے اوقات میں بھی خدا کی یاد کا اہتمام ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایمان والوں نے یہ حکم نازل ہونے کے بعد محض نمازیں پڑھی ہی نہیں بلکہ نمازوں کو قائم کیا تھا۔ نمازیں باجماعت ادا کی تھیں، خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی تھیں، بیماری اور تندرستی میں ادا کی تھیں۔ جوانی اور بڑھاپے میں ادا کی تھیں، مردوں اور عورتوں نے ادا کی تھیں۔ اور جس مسلمان کو بھی کسی نماز باجماعت میں نہ دیکھا گیا یا جلدی جلدی ہیں اور کسل مندی کی حالت میں نماز پڑھتے دیکھا گیا، اُسے منافق سمجھا جانے لگا۔ یہ ایمان ہی کی برکت تھی کہ انہیں نمازوں کی بروقت اور

باجماعت ادائیگی میں طمانیتِ قلب نصیب ہوتی تھی اور خدا کے گھر میں حاضری سے سکون مل جاتا تھا۔

نماز کے بعد جب ان پر روزے فرض کئے گئے اور سال بھر میں ایک ماہ کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس حکم کو بھی انہوں نے دل وجان سے قبول کیا اور اس روزہ کو خدا کی عبادت کے طور پر ایک ریفریشر کورس سمجھتے ہوئے خلوصِ دل سے قبول کر لیا۔ اور اسے نفسیاتی خواہشات وجذبات پر کنٹرول کرنے، قرآن پاک کی تعلیمات کو ذہن میں تازہ کرنے، ایک دوسرے سے ہمدردی وخیر خواہی کرنے خدا کی رضا حاصل کرنے، جسمانی اور روحانی فوائد حاصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھا اور سال بھر میں پورا ایک ماہ سارے معاشرہ کے لئے ایک ایسی سازگار فضا پیدا کر دی، جس میں نیکی کے راستہ پر چلنا آسان ہو گیا۔

نماز، روزہ کے بعد جب تیسرے حکم کے طور پر اُن پر حج فرض کیا گیا کہ ایمان والوں میں سے صاحبِ حیثیت لوگ زندگی میں ایک بار لازمی حج کریں اور بیت اللہ کی زیارت کے لئے اہل ایمان دنیا کے ہر گوشہ سے کھچے چلے آئیں، اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر اپنے گھر بار کو چھوڑ کر، دور دراز اور دشوار گذار راستوں کو طے کرتے ہوئے فریضہ حج ادا کریں تو اس میں بھی انہوں نے والہانہ شوق کا مظاہرہ کیا اور آج تک کیا جا رہا ہے۔

ان احکام کے بعد ایمان والوں میں سے صاحبِ نصاب لوگوں کو سال کے بعد اپنے مال تجارت، زیورات اور اندوختوں میں سے زکواۃ وعشر کی متعین رقم نکال کر اسلامی حکومت کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا تو اس مالی قربانی کی بھی انہوں نے پوری پابندی کی اور ایک ایک پائی کا حساب کر کے اپنے اموال۔ زیورات

مویشیوں اور زمین کی پیداوار سے زکوٰۃ و عشر ادا کرنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے محض زکوٰۃ ہی ادا نہیں کی بلکہ رزق سے محروم لوگوں کی امداد، دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت، دین حق کو غالب کرنے کے لئے جہاد کی خاطر ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے مال پیش کر دیئے، کیونکہ وہ اپنے ایمان کی بدولت خدا کے دیئے مال و اسباب کو اس کی راہ میں خرچ کر دینے کو ایک نفع بخش سودا اور ایک سعادت سمجھتے تھے۔ جب انہیں اللہ کے دین کو باطل مذاہب پر غالب کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے پکارا گیا تو انہوں نے شوق و ذوق سے اپنی جانیں بھی پیش کر دیں اور ان کے نوعمر بچے تک ایڑیاں اونچی اونچی کر کے اپنے آپ کو اسلامی فوج میں بھرتی حاصل کرنے کے لئے پیش کرنے لگے۔ اُن کے دلوں میں مرتبۂ شہادت حاصل کرنے کے لئے ایسا شوق پیدا ہوا کہ جب وہ بیمار ہو جاتے تو رو رو کر دعائیں کرتے کہ ان کی موت کہیں میدانِ جنگ کی بجائے بستر پر نہ آجائے۔

فواحش و منکرات سے اجتناب

ان اسلامی احکام کے ساتھ ساتھ جب انہیں بری عادات، برے کاموں، غلط رسوم و رواج سے روکا گیا تو انہوں نے فوری طور پر اپنے ہاتھ پاؤں اپنی نگاہوں، اپنی زبانوں اور اپنے نفس کو خدا کی نافرمانی کے کاموں سے روک دیا وہ شراب کے رسیا تھے، جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو انہوں نے شراب کے مٹکے توڑ دیئے، جو شراب پی رہا تھا اس نے منہ میں انگلیاں ڈال کر قے کر دی، چوری اور ڈکیتی چھوڑ دی، جؤا اور پانسے چھوڑ دیئے، حیاء کے جذبے سے مردوں اور عورتوں نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں، بے پردگی اور نمائش چھوڑ کر پردہ داری اختیار کرلی، بازاروں میں بن سنور کر نکلنا چھوڑ دیا، قتل اور غارت گری چھوڑ دی، سود کا لین دین بند

کردیا، رشوت چھوڑ دی، ملاوٹ ترک کردی، جھوٹ لوٹنا بند کر دیا، گالیاں دینے سے زبانوں کو روک لیا۔ شہوت پر کنٹرول کرکے زنا سے باز آگئے، لڑائی جھگڑے چھوڑ دیئے شیطانی خواہشات اور گھٹیا جذبات پر کنٹرول کر لیا۔ حسد، دشمنی، کینہ پروری اور بغض کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے ایسے بھائی بھائی بن گئے کہ ان کی سوسائٹی خیر خواہی اور امن کا گہوارا بن گئی۔ ایک اکیلی عورت کو بھی جنگل کے دور دراز سفر تک میں اپنے زیورات چھن جانے کا خوف نہ رہا، غربت اس طرح ختم ہوئی کہ ڈھونڈے سے کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہ ملتا تھا۔

اسلامی سوسائٹی

یہ اسلامی سوسائٹی کیسے وجود میں آگئی کہ اس میں سے ظلم و زیادتی ختم ہوگئی، بد عہدی اور بد دیانتی ختم ہوگئی جھوٹ اور فریب رخصت ہوگیا۔ خلیفۂ وقت، رعایا کی ذمہ داری سے کانپتا تھا، رعایا خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس سے کانپتی تھی۔

کیا ہماری دینی اور سیاسی جماعتوں اور ہمارے مذہبی اور سیاسی راہنماؤں نے کبھی سوچا کہ یہ سوسائٹی کس طرح وجود میں آگئی تھی؟ اس سوسائٹی کو وجود میں لانے کے لئے اور اس امتِ مسلمہ کو برپا کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی حکیمانہ ترتیب استعمال کی تھی؟ وہ ترتیب یہی تو تھی کہ آپؐ نے ابتدا میں لوگوں کے دلوں کی کھیتیوں میں "ایمان" کا بیج بویا تھا۔ اس ایمان کے بیج کی خدا خوفی کے جذبہ سے آبیاری فرمائی تھی، اس آبیاری کے نتیجہ میں ایمان کے بیج سے، دلوں کی کھیتی سے احکام الٰہی کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کی وہ لہلہاتی فصل برآمد ہوئی تھی جس نے اس پاکیزہ سوسائٹی کو قیامت تک کے لئے بہترین اور مثالی سوسائٹی کا اعزاز عطا کر دیا۔

اگر آج پھر مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرنے اور ان کی شوکت رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کرنے والے لیڈر و راہنما اور ان کی دینی و سیاسی جماعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اس طریقہ کو اپنا لیں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا شعور تازہ کر کے ان کو اعلیٰ اخلاق و کردار سے آراستہ کرنے میں لگ جائیں تو امت مسلمہ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور یہ کام محض کسی ایک جماعت کے کرنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ مسلمانوں کی ساری جماعتوں اور حکمرانوں کو بھی یہ کام کرنا ہوگا۔ جب کہیں یہ امت مسلمہ ایک خوشگوار انگڑائی لے کر خود اپنی اصلاح بھی کر سکے گی اور غیر مسلموں کو بھی اس خیر و بھلائی اور امن و سلامتی کے نظام کی طرف دعوت دے سکے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہر مسلمان ملک میں اس قسم کی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔

تیسرا قدم

تیسرے قدم کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکاروں میں خدا خوفی، تقویٰ اور پرہیزگاری کی کیفیت پیدا کر دی جس کی اسلامی احکام کی پابندی میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے اشد ضرورت تھی۔

یہ تقویٰ اور پرہیزگاری دراصل نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ خدا کا بندہ اور غلام ہونے کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کا احساس ہو اور یہ جذبہ اخلاص کے ساتھ اسلامی احکام کی پابندی اختیار کرنے پر اُسے راضی کر دے اور اگر کہیں اس کے گرد و پیش کے ماحول میں خدا کی نافرمانی یا خدا کے رسولؐ کی سنّت کی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو اس کا دل تڑپ جائے اور وہ ان حالات کو بدلنے کی کوشش کرنے کے لیے بےچین ہو جائے۔

چوتھا قدم

پھر چوتھے قدم کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی جماعت میں عظمت کے بلند ترین مقام کے طور پر "احسان" کی کیفیت بھی پیدا کر دی تھی "احسان" اسلام کا چوتھا اور بلند ترین مقام ہے اور ایک مومن کے دل میں جب احسان کی کیفیت اور جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا دل پُر نور اور کشادہ ہو جاتا ہے، ایک حدیث شریف کے مطابق جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضورؐ سے احسان کے متعلق سوال کیا تھا، کہ اے اللہ کے رسولؐ یہ فرمائیے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا تھا، "احسان یہ ہے کہ تو" اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرے کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو پھر یہ کیفیت ہونی چاہیئے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ احسان کی یہ منزل انسان کو عظمت کے بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے، انسان اسلامی احکام کی پابندی میں رخصتیں ڈھونڈنے کی بجائے اُن میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے لئے تیار رہتا ہے۔

"احسان" دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے ساتھ گہری محبت، قلبی لگاؤ، سچی وفاداری اور جان نثاری کا نام ہے جو ایک مسلمان کو محسنین کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہے۔

چنانچہ جہاں تقوےٰ کی بنیادی کیفیت "خدا کا خوف" ہوتا ہے۔ جو انسان کو ہر معاملہ میں اس کی ناراضگی سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، وہاں "احسان" کی بنیادی کیفیت خدا کی محبت ہوتی ہے، جو ہر وقت انسان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے پر ابھارتی رہتی ہے۔

اس طرح سمجھ لیجئے کہ مُتقین کی مثال کسی حکومت کے اس ملازم کی سی ہوتی ہے جو نہایت فرض شناسی اور تندہی سے وہ تمام خدمات سر انجام دیتا ہے، جو

اس کے سپرد کی گئی ہوں، تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پابندی کرتا ہے اور کوئی بھی قابلِ اعتراض کام نہیں کرتا۔

محسنین، حکومت کے اُن مخلص اور جاں نثار وفاداروں کا گروہ ہوتا ہے، جو دل و جان سے حکومت کے خیر خواہ ہوتے ہیں، صرف وہی خدمات سرانجام نہیں دیتے ہیں جو اُن کے سپرد کی گئی ہوں بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ فکر لگی رہتی ہے کہ حکومت کے مفاد کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے، حکومت کے قانون کی کسی جگہ بھی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو اُن کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔

ایمان والوں کے ذہنوں میں اسلام نے یہ صفات پیدا کر کے وہ اخلاص اور یکسوئی پیدا کر دی تھی کہ ان کے دل طمانیت قلبی سے مالا مال ہو گئے تھے۔

بظاہر احوال ان کے کپڑوں میں اگرچہ پیوند لگے نظر آتے ہوں، اُن کے مسکن کچی جھونپڑیوں کے ہوں، اُن کے بستر ٹاٹ کے ہوں، اُن کے دستر خوانوں پر جَو کی روٹی ہو، اُن کی سواری کے لئے گدھے یا اونٹ کے سوا کچھ نہ ہو، مگر اُن کی نگاہیں زمین کی پستیوں میں نہیں بلکہ آسمانوں کی بلندیوں پر ٹکی ہوتی تھیں، ان کے ذہن دنیا پرستی کی بجائے خدا پرستی سے سرشار ہوتے تھے، وہ زمین کی خبروں کے ساتھ آسمان کی صداؤں کو بھی سنتے تھے، جسمانی تقاضوں کے ساتھ روح کے تیوروں کو بھی پہچانتے تھے، اور یہ سارے مقامات انہیں، ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی بدولت ہی حاصل ہوئے تھے۔

آج کے انسان بھی اگر ان مقامات کی تلاش میں ہیں تو یہ مقامات انہیں اسی راستہ سے مِل سکتے ہیں اور یہی صراطِ مستقیم ہے جسے ہمیں اختیار کرنا چاہئے، ان چاروں مقامات سے گذرنا ناگزیر ہے۔

اپنی حالت کیا ہے!

مگر ہم جب اپنی حالت پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں مسلمان ماں باپ کے گھروں میں پیدا کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کر دیا تھا مگر ہم نے اس کی قدر نہ کی، اسلامی سوسائٹی میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں وہ تمام مراعات اور حقوق تو حاصل ہو گئے مگر ہم نے کبھی اپنے فرائض کے متعلق غور نہ کیا۔ ہم نے کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کے معنی و مفہوم کو بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی، اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کی فکر نہ کی، ہم ایمان کی شمع سے اپنے دلوں کو منور کر لینے سے غافل ہو گئے. ہماری زندگیاں اسلامی احکام کی پابندی سے آراستہ نہ رہیں، ہماری نگاہوں سے ایمان اسلام، تقوے اور احسان کی منزلیں اوجھل ہو گئیں، ہمارے قدم ان راہوں کی طرف سے بڑھنے میں بوجھل ہو گئے، ہم زر و مال، زمین اور زن کے چکر میں پڑ گئے۔ ہمیں جب بھی صلحائے امت نے خدا کی رضا جوئی کے اعلیٰ نصب العین کی طرف بلایا تو ہم زمین سے چپٹ کر رہ گئے ہم نے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو چھوڑ کر ادنیٰ مقاصد کو اختیار کر لیا۔ اس طرح سے ہماری زندگیاں بھی اطمینان و سکون سے محروم ہو کر رہ گئیں۔ ہمیں اب پھر اپنی غفلتوں کو چھوڑ کر اسلامی احکام کی پابندی اختیار کر کے اطمینان و سکون کا راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے
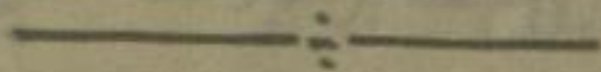
اسلام ہمارے جسم، نفس، روح کی ضروریات اور تقاضے کس خوبی سے پورے کرتا ہے

اب ہم دیکھیں گے کہ اسلام ہمارے اس مادی جسم، ہمارے نفس کی خواہشات و جذبات اور روحانیت کے تقاضے کس طرح پورے کرتا ہے، تاکہ ہم شرح صدر اور اطمینانِ قلب سے اسلامی نظامِ زندگی کو اختیار کر سکیں۔

ہماری جسمانی ضروریات

ہمارے جسم کو اپنی زندگی بحال رکھنے کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر طرح کے سامان پیدا فرما دیئے ہیں۔ ہمیں سانس لینے کے لئے ہوا کی ضرورت تھی۔ ہوا کو وافر مقدار میں پیدا فرما کر ہمیں بلا معاوضہ مہیا فرما دیا، ہمیں پانی کی ضرورت تھی۔ پانی کو زمین میں بھی رکھ دیا اور اسے آسمانوں سے بھی نازل کرنے کا اہتمام فرما دیا، ہمیں خوراک اور غذا کی ضرورت تھی، اس کے لئے قسم قسم کے غلے، اجناس، سبزیاں، پھل، میوہ جات، پرندے، مچھلیاں دودھ اور گوشت مہیا کرنے والے جانور پیدا فرما دیئے، ہمیں صحت کی بحالی اور بیماریوں کے علاج کے لئے ادویات کی ضرورت تھی، اس غرض کے لئے عجیب و غریب خواص رکھنے والی جڑی بوٹیاں اور ادویات پیدا فرما دیں۔ جسم کے لئے لباس اور رہائش کے لئے مکانات کی ضرورت تھی، اس کے لئے بھی طرح

طرح کے سامان مہیا فرما دیئے۔ اور حضرت انسان کو بتا دیا کہ تمہارے خدا کی طرف سے تمہارے لئے یہ سب سامان ضیافت ہے۔ اسے عزت و وقار سے کھاؤ اور ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کی بجائے انسانیت کے دائرہ میں رہتے ہوئے استعمال کرو۔

پھر اسلام نے انسان کی ان بنیادی ضروریات کو دوسرے مذاہب کی نسبت کہیں زیادہ اہمیت دی ہے اور اسلامی حکومت کے سربراہوں کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اس بات کی مسلسل نگرانی کرتے رہیں کہ ان کی رعایا کا کوئی فرد بھی خوراک لباس، مکان اور علاج جیسی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ حکام کے علاوہ عام مسلمانوں کو بھی ہدایت کر دی گئی کہ ان کا کوئی پڑوسی بھوکا نہ رہ جائے، کھانے پینے کی چیزیں ایک دوسرے کے گھروں میں بھجوانے کی تلقین کی گئی، نماز باجماعت جیسی عظیم عبادت سے بھی کھانا سامنے آجانے کی صورت میں رخصت عطا کر دی گئی، ایسے حالات میں جب کہ عام لوگ غلہ کے ضرورت مند ہوں یا قیمتیں بڑھانے کی نیت سے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دے دیا گیا، اس بات کی ممانعت کر دی گئی کہ انسان خود اپنے جسم کو یا کوئی دوسرا اس کے جسم کو نقصان پہنچائے یا خودکشی کی حرکت کرے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کی ترغیب دی گئی مگر بے اعتدالی اور بسیار خوری سے روکا گیا تاکہ اس کا جسم بیمار نہ پڑ جائے، دیگر مذاہب کے ایجاد کردہ عبادات کے وہ طریقے جن سے انسان کے جسم پر ناروا مشقت کا بوجھ یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، منسوخ کر دیئے گئے، جیسے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کرنا، زمین کے گڑھے میں نصف بدن کو دفن کر کے عبادت کرنا، پانی یا دریا میں کھڑے ہو کر عبادت کرنا، مسلسل روزے رکھنا، بلا وجہ ٹاٹ کا لباس استعمال کرنا، دنیوی مصروفیات اور ذمہ داریوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چلے جانا، لباس اتار دینا،

ازدواجی زندگی اختیار نہ کرنے وغیرہ کے طریقے اپنانے سے منع کردیا گیا۔

اسلامی عبادات کا پاکیزہ نظام

اسلام نے عبادات کا ایک ایسا متوازن اور معتدل نظام تجویز کیا ہے، جس میں انسان کے بدن، ذہن، روح اور قلب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کے جسم کی صفائی، طہارت اور پاکیزگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے تاکہ اس کا جسم تندرست اور صحت مند رہ سکے، اس کی ظاہری شکل وصورت کی آرائش وزینت کی بھی تلقین کی گئی۔ اسے کھانے پینے، چلنے پھرنے، بول چال، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور مجلس تک کے بھی آداب سکھائے گئے تاکہ انسان کا جسم ہر معاملہ میں باوقار رویہ اختیار کرسکے۔

نماز کی پابندی کا حکم اور اس کی مصلحتیں

اسلام نے عبادات کے سلسلہ میں سب سے پہلے نمبر پر نماز کا حکم دیا ہے۔ یہ نماز اسلام کے پانچ ارکان، توحید، نماز، روزہ حج، زکوٰۃ میں سے ایک اہم اور بنیادی رکن ہے، رکن ستون کو کہتے ہیں، یہ پانچ ستون ایسے ہیں جن کے بل پر اسلامی نظام زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور نماز اسلام کا رکن عظیم ہے، اس کو عماد الدین یعنی دین کا سہارا قرار دیا گیا ہے جس نے اس کی پابندی نہ کی اس نے دین کی عمارت کو گرادیا۔ مگر آج دین سے غفلت کے نتیجے میں جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، جو اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لئے بلا رہا ہے، وہ بھی مسلمانوں کی صف میں شمار ہوتے ہیں اور یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ (نعوذ باللہ) نماز کی کوئی اہمیت اسلام میں نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان

ہو سکتا ہے، بلکہ مسلمانوں کی جماعتوں کا امام، قائد اور لیڈر بھی بن سکتا ہے۔ حالانکہ ابتدائے اسلام میں یہ کیفیت نہ تھی۔ ایک مستند روایت میں ہے۔

"کان اصحاب النبی صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ (ترمذی)

(یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے، جس کو چھوڑ دینا کفر ہے۔)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"بین العبد و بین الکفر ترک الصلوٰۃ (مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ)

"بندے اور کفر کے درمیان ترک صلوٰۃ واسطہ ہے" یعنی ترک صلوٰۃ وہ پل ہے جس کو عبور کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف چلا جاتا ہے۔

اسی بنا پر رحمۃ للعالمینؐ نے فرمایا کہ "جو لوگ اذان کی آواز سن کر گھروں سے نہیں نکلتے میرا جی چاہتا ہے کہ اُن کے گھروں میں آگ لگا دوں"

اسی لئے مسلمانوں کے لئے پنجوقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رُو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبکدوش تو ہو سکتا ہے، مگر وہ گنہگار ہوگا، اگر قصداً بلا عذر مسجد میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔

قرآن پاک میں بھی منافقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

"وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (النساء ۱۴۲)

"یعنی وہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو (شوق کی بجائے) اس طرح کسمساتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اٹھتے ہیں کہ گویا اُن کی جان پر بن رہی ہے" اور

"الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون)
یعنی وہ نمازوں سے غافل ہوتے ہیں"

ائمۂ اربعہ) چاروں فقہائے کرام نے بھی ترکِ نماز کے فعل کو قابلِ سزا جُرم قرار دیا ہے۔

نماز کیلئے جسم کی صفائی اور طہارت

نماز کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ

نماز کی جگہ پاک ہو
نماز کے کپڑے پاک ہوں
نماز کے لئے جسم پاک ہو
نماز کے لئے وضو کیا جائے

نماز کے لئے جگہ، کپڑوں اور بدن کی پاکیزگی کے علاوہ وضو کو بھی لازم قرار دیا گیا کہ انسان خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے جسم کے وہ سارے حصّے اچھی طرح دھو ڈالے، جو لباس سے باہر رہتے ہوں اور جن پر گرد و غبار پڑتے رہنے کا اندیشہ ہو سکتا ہو، ہاتھ منہ، چہرہ اور پاؤں دھونے کے ساتھ ساتھ کلی کر کے منہ اندر سے صاف کرنے اور مسواک کے ذریعہ دانتوں کی صفائی کا بھی حکم دیا گیا تاکہ انسان پانچ وقت منہ اور دانتوں کی صفائی کرتا رہے، کیونکہ اکثر جسمانی بیماریاں منہ اور دانتوں کی عدم صفائی سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ذرا جسم کی صفائی و طہارت کے معاملہ میں نفاست کا اندازہ لگائیں کہ انتڑیوں سے ہوا خارج ہونے پر دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا گیا۔ پسینہ کی بدبو والے کپڑے پہن کر عبادت کے لئے جانے سے منع کیا گیا، بدبودار چیزیں، کچا پیاز، لہسن، حُقّہ، سگریٹ یا مولی وغیرہ استعمال کر کے مسجد میں جانے سے روک دیا گیا۔ بلکہ خوشبو استعمال کرنے کی ترغیب

دی گئی۔ ذرا غور فرمایئے کہ بدن کی صفائی و طہارت کے معاملہ میں اس قدر نفاست کا اہتمام کون سا مذہب کرتا ہے؟ اسلام نے ہی ایک نماز کی ادائیگی کے موقع پر انسان کے بدن کو پاکیزگی، طہارت اور نفاست کے نہایت اعلیٰ معیار تک پہنچا دیا ہے اور یہ کام صبح کی نماز کے وقت یعنی نیند سے بیدار ہونے پر طلوعِ آفتاب سے قبل شروع ہو جاتا ہے اور رات کو بستر پر جانے تک پانچ وقت جاری رہتا ہے۔ ایسا پاک اور صاف جسم اور پاکیزہ ذہن اپنے دینوی کاموں کو کیسی خوبی کے ساتھ سرانجام دیتا ہوگا۔ اور جسم کو کیسا سکون و اطمینان ملتا ہوگا۔

• اسلام نے بدن کی ظاہری آرائش و تزئین کو بھی پسند کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک صحابیؓ کے چہرہ کے بال الجھے ہوئے اور بکھرے ہوئے دیکھے تو فرمایا کہ اپنے بالوں کو سنوار لیا کرو، اَللّٰہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَال" اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے" اسی طرح لباس کے متعلق حکم دیا گیا کہ لباس اُجلا اور صاف ہونا چاہیئے اور لباس سے انسان کی مالی حیثیت کا اظہار ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ انسان مالی لحاظ سے آسودہ حال ہو مگر لباس پھٹا پرانا استعمال کرے اور میلا کچیلا رہے، خدا کے دربار میں بھی جب نماز کے لیے حاضر ہو تو اچھا لباس پہن کر اور زینت کے ساتھ آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عیسائی لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے تھے اور یہودی داڑھی کو بالکل صاف کرا دیتے تھے، حضورؐ نے ان دونوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے مسلمانوں کو منع فرمایا اور حکم دیا کہ وہ نہ داڑھی یہودیوں کی طرح بالکل صاف کرائیں اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح بے تحاشہ بڑھائیں بلکہ درمیانی صورت کی داڑھی ضرور رکھیں تاکہ مسلمانوں کی الگ شناخت ہو سکے۔

نماز کی ترتیب میں حکمت

اب ذرا نمازوں کی ترتیب ملاحظہ فرمایئے کہ ان میں حکمت کے اصولوں کو کس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جن نمازوں کے اوقات میں انسان کا معدہ خالی ہوتا ہے، ان میں رکعتوں کی تعداد کم رکھی گئی، مثلاً فجر، عصر اور مغرب کی نمازوں میں صرف ۲، ۴ اور ۳ فرض پڑھنے کا حکم دیا گیا اور فجر اور مغرب کی نمازوں میں صرف ۲، ۲ سنتیں ادا کرنے کی تلقین کی گئی۔ مگر جب کھانے کے بعد نماز کا وقت آتا ہے تو نماز کی رکعتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ظہر اور عشاء کی نمازوں میں ۱۲ سے ۱۷ تک رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔

ماہِ رمضان المبارک میں افطاری کے وقت زیادہ پانی اور کھانے کا امکان ہوتا ہے اس لئے نماز عشاء کے ساتھ آٹھ یا بیس تراویح کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر پانچوں وقت نمازیں صحیح طور پر ادا کی جاتی رہیں تو ہر عمر کے مردوں اور عورتوں کے لئے نہایت متوازن اور مناسب طریقہ سے جسم کو ہلکی پھلکی حرکت ملتی رہتی ہے اور جسم چاق و چوبند اور تندرست رہتا ہے۔ ہم عام طور پر نماز کی ادائیگی میں کوتاہیاں کر جاتے ہیں اور نماز کے ارکان، تکبیر، اقامت، سجدہ، رکوع، تشہد اور سلام پھیرنے کے تمام آداب کو ملحوظ نہیں رکھتے، جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے مثلاً:

ہم رکوع کی حالت میں اپنی کمر کو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اتنا نہیں جھکاتے کہ وہ زمین کے متوازی ہو جائے۔ بلکہ جلدی میں تھوڑا سا جھک کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ کمر کو پورا جھکا کر پیٹھ کو زمین کے ساتھ ہموار رکھنا چاہیئے۔ جب رکوع صحیح ہوتا ہے۔

سجدہ کو جانے سے پہلے رکوع سے اُٹھ کر اپنی کمر کو سیدھا کر کے پھر سجدہ کرنا چاہیئے اور سجدہ میں اس حالت میں جائیں کہ ہمارے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں گھٹنوں پر ٹکی ہوں اور زمین پر سب سے پہلے ہمارے گھٹنے لگیں پھر ہاتھوں کو سجدہ کی جگہ پر اپنے کانوں کی سیدھ میں رکھیں اور پہلے ناک اور پھر پیشانی کو زمین پر رکھیں۔

پھر جب سجدہ سے اٹھیں تو پہلے پیشانی اُٹھے پھر ناک اُٹھے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر پہلے گھٹنوں کو زمین سے اٹھائیں اور کھڑے ہو جائیں یعنی سجدہ میں جاتے وقت بھی ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر لگنے چاہئیں اور سجدہ سے اٹھتے وقت بھی گھٹنے اس حالت میں زمین سے اٹھائیں کہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوں۔

نماز کے آخر میں سلام پھیرتے وقت بھی گردن کو پوری طرح دائیں اور بائیں موڑ کر سلام کہنا چاہیئے، تاکہ گردن کو خوب حرکت ہو جائے۔

سجدے میں عورتوں کے لئے گھٹنوں کو چھاتی سے لگا لینا بہتر ہے۔ یہ بچہ دانی کے پیچھے کی طرف گر جانے کا بہترین علاج ہے۔

سجدے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ دوران خون دماغ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جس سے دماغ کو تقویت ملتی رہتی ہے، دماغ کا محل وقوع ایسا ہے کہ عام حالات میں دماغ تک خون نہیں پہنچتا، حالانکہ دماغ کو خون کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور اس کی یہ ضرورت پانچ وقت کی نمازیں پوری کرتی رہتی ہیں۔

نماز کی رکعتوں کی تعداد مقرر کرنے اور نماز کی ادائیگی کا طریقہ مقرر کرنے میں اسلام نے جن حکمتوں کا لحاظ رکھا ہے اُن سے اس عبادت کے سرانجام دینے سے انسان کے بدن کو بھی صحت کے نقطۂ نظر سے بہترین فوائد حاصل ہوتے رہتے ہیں۔

یعنی اگر انسان کو کاروباری مصروفیات کی وجہ سے صبح سویرے سیر کرنے یا کسی قسم کی ورزش کرنے کا موقع نہ بھی ملے تو یہ پنجوقتہ نماز کی پابندی اس کی اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیتی ہے۔ اگرچہ ہمیں نماز اس ورزش کی نیت سے نہیں پڑھنی چاہیئے بلکہ اپنے خدا اور خدا کے رسولؐ کے حکم کی اطاعت میں عبادت کے طور پر ادا کرنی چاہیئے اور یہ ضمنی فوائد اس سے خود بخود حاصل ہوتے رہیں گے۔

اصلاحِ نفس میں نماز کا حصّہ

ان جسمانی فوائد کے علاوہ نماز ہمارے نفس کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا اور نہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ انسان دنیا کو ”چھوڑ“ کر کونوں، گوشوں یا خانقاہوں میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرے بلکہ وہ دُنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے ہی خدا کی عبادت کرے۔ اس لئے نماز انسان کو پانچ وقت اس کی کاروباری اور گھریلو مصروفیات میں سے الگ کر کے خدا کے دربار میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کی طرح زیادہ زور پوجا پاٹ پر نہیں دیا ہے، جو اپنے معبودوں کو انسانوں پر قیاس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں۔ نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے سے پسیج جاتے ہیں۔ اسی طرح اُن کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہارِ عاجزی کا طالب ہے اور وہ بھی چند مخصوص اوقات میں پوجا پاٹ کی خاص مراسم ادا کرنے سے راضی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بعد ہر انسان آزاد ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہے انجام دیتا رہے۔ اس کے برعکس چونکہ اسلام کا تصورِ عبادت یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی خدا کی بندگی

میں بسر ہو، انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی کرے، خدا کی شریعت کے مطابق کرے

اسی تصور کی بناء پر اسلام نے اپنی عبادات کا نظام دوسرے مذاہب سے الگ تجویز کیا ہے، جو اس کے اپنے تصور عبادت کے عین مطابق ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ نماز انسان کے نفس اور ذہن کی کس طرح تربیت کرتی ہے۔

معرفت نفس

نماز انسان کے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ رکھتی ہے کہ وہ صرف خدا کا بندہ اور غلام ہے اور اُسے دنیا میں جو کچھ بھی کرنا ہے اپنی اس حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہی کرنا ہے۔ اس کے گردو پیش پھیلے ہوئے شیطان اور خود اس کے نفس میں بیٹھا ہوا شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی اس حیثیت کو بھول کر شیطانوں کی بندگی اختیار کرلے، مگر یہ نماز اُسے بار بار یاد دلاتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، نفس کے بندے نہیں ہو۔ صبح اٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے نماز انسان کو یاد دلاتی ہے کہ سارا دن اُسے خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے گزارنا چاہیئے، دن کے ہنگاموں کے دوران میں بھی دو دفعہ یہی نماز انسان کو الگ بلا کر خدا کے دربار میں حاضر کر دیتی ہے اور رات تک بار بار یاد دلاتی رہتی ہے۔

فرض شناسی اور اطاعت امر

ہر مسلمان دن رات اسلامی سوسائٹی سے اپنے حقوق و مراعات حاصل کرتا رہتا ہے مگر یہ نماز انسان کو اس کے فرائض یاد دلاتی رہتی ہے۔ اُسے بتاتی ہے کہ خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر وقت بر سر کار (ON DUTY) ہے اس کے لئے ہر وقت ایک معرکۂ کارزار گرم ہے، کہیں اُسے شیطانی مرغوبات نفس

پر کنٹرول کرنا ہے، کہیں اُسے باطل نظریات و نظاموں سے جنگ کرنی ہے کہیں شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، کہیں شرعی حدود کی حفاظت کرنی ہے اور احکام خداوندی کو نافذ کرنا ہے۔ اس طرح نماز اُسے پانچ وقت خدا کے دربار میں حاضر کرکے اُس کے فرائض یاد دلاتی ہے اور اس کے اندر اطاعتِ خداوندی کا جذبہ پیدا کرتی ہے پانچ وقت کی اذان سن کر جو لوگ اپنی دنیوی مشغولیتوں کو چھوڑ چھاڑ مسجد میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ صرف اُن سے ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خدا کے دوسرے احکام کی بھی پابندی کریں گے، بشرطیکہ وہ نماز محض رسم کے طور پر یا بلا سوچے سمجھے نہ ادا کر رہے ہوں۔

نماز روزانہ پانچ بار ہر مسجد میں مسلمانوں کے لئے اذان کا ایک بگل بجاتی ہے، تاکہ اللہ کے یہ سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں اور اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ اپنے فرائض کو پہچانتے ہیں اور اللہ ہی کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں اور اس کے احکام بجالانے کے لئے ہر وقت مستعد ہیں اور جو لوگ اذان کی آواز سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے، اپنے کاروبار یا دوسری مصروفیات کو خدا کے دربار میں حاضری کے لئے نہیں چھوڑتے، وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ اپنے فرض کو پہچانتے ہی نہیں ہیں یا اگر پہچانتے ہیں تو اُسے ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس طرح نام کے مسلمانوں اور سچے مسلمانوں کی پہچان ہوتی رہتی ہے۔

ڈسپلن اور ضبطِ نفس

اسلام چونکہ ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا اولین مقصد نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے۔ جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ غرضیکہ تمدن کے ہر شعبے میں ایک خاص کردار ادا کرنا ہے۔ اس لئے اسلام اسی نماز و روزہ

کے ذریعے مسلمانوں میں اپنے نفس پر کنٹرول کر کے ایک خاص ڈسپلن کا پابند بناتا ہے
نماز اگرچہ ایک عبادت ہے اور اسے گھر میں یا تنہائی میں پڑھنے سے زیادہ یکسوئی حاصل ہو
سکتی ہے مگر اسے بلا عذر گھر میں پڑھنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ نمازیں محلہ کی مسجد میں
حاضر ہو کر ایک خاص صف بندی اور نظم کے تحت باجماعت ادا کی جائیں اور ایک امام کی تابعداری
میں ادا کی جائیں اور جمعہ کے روز تمام مسلمان جامع مسجد میں اکٹھے ہو کر نمازِ جمعہ ادا کریں اور پھر
پہ تمام شہر کے لوگ عید گاہ میں اکٹھے ہو کر ایک امام کی تابعداری میں نمازِ عید ادا کریں۔

اسلام دنیا میں امتِ مسلمہ کے نام سے جو سوسائٹی یا جماعت تیار کرنی چاہتا
ہے، اس کے ایک ایک فرد کو بھی نماز کے ذریعہ اس طرح تیار کرتا ہے کہ دس
برس کی عمر کے بعد ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی پر نماز فرض کر دی گئی ہے، یہ فرض کسی
حال میں بھی معاف نہیں ہوتا۔ اِلّا یہ کہ کوئی اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت
حیض و نفاس کی حالت میں ہو، بیماری میں سفر میں، جنگ میں معرکہ تک میں یہ فرض
اُسے ادا کرنا پڑے گا، کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھنا ممکن نہ ہو تو لیٹ
کر پڑھے، گویا نماز کا وقت جب آجائے تو ہر حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس
فرض کو ادا کرے۔ اس طرح اسلام ایک ایک مسلمان کو ضبطِ نفس کی تربیت دے
کر ایک تنظیم (ڈسپلن) کا بھی پابند بنا دیتا ہے تاکہ وہ جماعتی زندگی اختیار کر کے دوسر
لوگوں کے ساتھ مل کر اور ان کے تعاون سے خدا کے دین کو غالب کرنے کا کام کر
سکے، کیوں کہ کسی اکیلے مسلمان کے لئے چاہے وہ کیسی ہی صلاحیتوں اور تقوے
کا مالک کیوں نہ ہو۔ خدا کے باغی منظم گروہوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی
لیے خدا کے پیغمبروں نے بھی نیک اور پاکباز لوگوں کی باقاعدہ جماعتیں منظم کر کے
کفر و باطل کا مقابلہ کیا تھا۔

روحانیت کی پرورش میں نماز کا حصہ

نماز ہمارے جسم اور نفس کی بہبود کے علاوہ ہماری روحانیت کی پرورش کے لیئے بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ نماز کیسی مقدس عبادت ہے، کہ اس کی تیاری کے لیئے ایک مسلمان پہلے قدم کے طور پر اپنے دفتری کام، اپنی کاروباری مشغولیت اور اپنی گھریلو مصروفیات کو چھوڑ کر مسجد کی طرف چل پڑتا ہے، وضو کے ذریعہ اپنے جسم کے ظاہری اعضاء کو پاک صاف کرتا ہے۔ اور نماز میں داخل ہونے کے لیئے اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر تکبیر اللہ اکبر کے ذریعہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ دنیا کے کاموں سے دست بردار ہو رہا ہے اور دونوں ہاتھ باندھ کر اپنے بادشاہ حقیقی کے سامنے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ حاضر ہو گیا ہے، یہ دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے آگے ہر قسم کی مزاحمت کو ترک کر کے (Surrender) کر دیا ہے اور جن چیزوں کے ساتھ وہ اب تک تعلق رکھتا تھا۔ اُن سے اس نے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ غلامانہ نیازمندی اختیار کرتے ہوئے اس کے دربار میں حاضر ہے کہ اُسے اپنے خدا کی طرف سے جو بھی حکم ملے گا، اُس کی بسر و چشم اطاعت کرے گا۔ اس طرح نماز میں داخل ہوتے ہی اس پر کھانا پینا ممنوع ہو گیا ہے اور دوسرے لوگوں سے اس کا ہر قسم کا رابطہ کٹ کر ایک خدا کے ساتھ جڑ گیا ہے اس خدا کے ساتھ جس نے اس کے مٹی کے جسد میں اپنی طرف سے روح پھونک کر اُسے گوشت و پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیا تھا۔ اپنے خدا کے سامنے وہ اس طرح کھڑا ہو گیا ہے جیسے وہ خود خدا کو دیکھ رہا ہے یا خدا اُسے

دیکھ رہا ہے جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، اس پر ایک ایسی عجیب سی امید اور خوف کی کیفیت (خشیت) طاری ہے۔ اس کے ذہن میں اگر کوئی دنیوی خیال آتا بھی ہے تو فوراً اُسے ذہن سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی زبان پر اللہ کا کلام جاری ہے اور اس کے دل و دماغ، اس کے معانی میں غور و فکر کر رہے ہیں، اس کی رُوح اس حالت میں اپنے خالق کے سامنے پا کر مسرت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبھی خدا کے سامنے انتہائی تذلل و عاجزی کے ساتھ رکوع میں جھکا ہے اور کبھی اپنی پیشانی کو سجدہ میں رکھ کر شاداں و فرحاں ہے۔ اپنی اس نماز کے خاتمہ پر دائیں اور بائیں السلام علیکم کہتا ہوا ہی اس حالت سے باہر آسکے گا۔ کیا انسان کی روح کو نماز کے علاوہ بھی ایسی معراج حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی لئے نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ الصلوٰۃُ معراج المومنین" ہے۔

آپ نماز کے متعلق ان مختصر مضامین سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے اپنی ہر عبادت میں کس طرح سے انسان کے جسم، نفس، قلب اور روح کی ترقی و بہبود کا خیال رکھا ہے۔ نماز کے علاوہ روزہ کی عبادت کی بھی یہی کیفیت ہے۔

روزہ

روزہ بھی سال بھر میں ایک ماہ کے لئے انسان کے جسم کی اوور ہالنگ کر دیتا ہے اور جسم کے اندر سے فاسد اور مضر صحت مواد کی کانٹ چھانٹ کر دیتا ہے۔ جسمانی فوائد کے علاوہ روزہ انسان کے نفس ذہن اور روح میں بھی خاص کیفیات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

جو شخص بھی رضائے الہٰی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے۔

۱۔ اس کو خداوندِ عالم کی ہستی کا اور ان کے عالم الغیب ہونے کا کامل یقین تھا، جس کی وجہ سے وہ تنہائی میں بھی روزہ کی پابندی کر رہا ہے۔

۲۔ اس کو آخرت پر، اس کے حساب وکتاب پر اور اس کی جزا و سزا پر بھی پورا یقین ہے جس کی وجہ سے وہ روزہ کی شرائط پوری کر رہا ہے۔

۳۔ اس کے دل کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے جس کی بنا پر وہ روزہ ایسی مشکل عبادت کو بھی سر انجام دے رہا ہے۔

۴۔ اس نے مادہ پرستی کی بجائے خدا کے حکم کی پابندی اور روحانیت کے راستے کو ترجیح دے دی ہے۔

۵۔ اس کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اُسے اپنے خدا کو راضی کرنے کے لئے انتہائی مشکل حالات میں بھی صبر کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

ان کیفیات کی بدولت جب اس نے پورا مہینہ روزے رکھے ہیں تو اس کے نفس کی تربیت اور روح کی ترقی کے سامان بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

ان عبادات کے ساتھ ساتھ اگر ہم ان تمام آداب کی پابندی کریں جو اسلام نے سکھائے ہیں تو ہماری زندگی بے شمار روحانی و جسمانی فوائد سے مالا مال ہو سکتی ہے، مثلاً کھانے پینے کے آداب، لباس کے آداب، لیٹنے اور سونے کے آداب سلام کے آداب، مجلس کے آداب، سفر کے آداب، طہارت کے آداب کا خیال رکھیں۔

بسیار خوری

کھانے پینے کے متعلق ہمیں اسلام نے جو یہ ہدایت دی ہے کہ:۔

"كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ"

(اعراف ۳۱۔ پارہ ۸)

"کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اس حکم میں کم خوری کی تلقین کی گئی ہے اور بسیار خوری سے منع کیا گیا ہے۔
آپؐ فرماتے ہیں "انسان کو اپنی کمر سیدھی رکھنے کے لئے چند لقمے ہی کافی ہیں اور زیادہ کھانا ہی پڑے، تو معدہ میں ایک تہائی کھانا ہو۔ ایک تہائی سانس لینے کے لئے جگہ خالی ہو"

"مسلمان ایک آنت سے کھاتا ہے اور کافر و منافق سات آنتوں سے کھاتا ہے"
"اللہ تعالیٰ بھوک سے زیادہ کھانے والے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے"
"جو شخص جتنی زیادہ شکم پُری کرے گا، اتنا ہی زیادہ لمبا عرصہ قیامت کو بھوکا رہے گا"

پھر فرمایا "بہت زیادہ کھانے والے سے اللہ کی پناہ مانگو"
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے کم خوری یعنی ایک دو لقمے کی بھوک رکھ کر کھانے کو مسلمان کی خصوصیات میں سے قرار دیا ہے۔ طبِ قدیم اور طبِ جدید نے بھی اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زیادہ کھانا نہ صرف بیماریوں کی جڑ ہے، بلکہ یہی عادت انسان کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیتی ہے اور زندگی کے بہت سے مصائب مثلاً فالج، مخبوط الحواسی، پیشاب پاخانہ کا بے قابو ہونا جیسی بیماریاں اسی عادتِ بد کا نتیجہ ہیں۔ بسیار خوری سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک، ذیابیطس، بلڈ پریشر امراضِ قلب، فالج اور موٹاپا ہیں، ذیابیطس (SUGER) کی وجہ انسولین (یعنی انتڑیوں کے پردہ پلنکر، اس کے ہارمون) کی کمی ہوتی ہے، انسولین ایک نہایت ہی کارآمد ہارمون ہے جو خوراک ہم کھاتے ہیں، اس کا بیشتر حصہ نشاستے (کاربوہائیڈریٹس) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نشاستہ چونکہ اس ہارمون کے

بغیر حراروں کیلئے استعمال نہیں ہو سکتا، اس لیئے خون میں شکر کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ زیادہ خوراک کھانے سے اس لبلبے کے پردہ کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور بار بار زیادہ کھانے سے اس لبلبے کے خلیے تھک کر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے جسم میں انسولین کی پیدائش کم ہو جاتی ہے اور انسان ذیابیطس کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری پھر کئی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہے اور بلڈ پریشر فالج اور دل کی بیماریاں ذیابیطس (Diabetes) کے مریض پر جلدی حملہ آور ہوتی ہیں۔

اسلام نے صحت کے نقطۂ نظر سے جن پرندوں اور جانوروں کے گوشت استعمال کرنے سے منع کیا ہے اُن میں بھی انسان کے لیئے جسمانی و روحانی فوائد کو پیش نظر رکھا ہے، پھر صرف اسلامی طریقہ سے ہی ذبح کیئے گئے جانوروں کا گوشت استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، اس میں بھی طبّی فوائد رکھے ہیں۔ جھٹکے کا گوشت، حرام پرندوں اور جانوروں کے گوشت چونکہ انسانی صحت کے لیئے مضر ہوتے ہیں۔ اسی لیئے ان کے استعمال سے روک دیا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو تمام اسلامی احکام میں انسان کے جسم، نفس اور روح کی بہبود کا خیال رکھا گیا ہے۔

ہمارے نفس کے تقاضے اسلام کس خوبی سے پورے کرتا ھے

انسانی بدن کی ضروریات پر بحث کرنے کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ہمارے نفس اور ذہن کی ضروریات کیا ہیں اور اسلام نے ان کو کس حُسن و خوبی سے پورا

کیا ہے۔

انسان کی نفسانی ضروریات اور عوامل کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خواہشات

۲۔ جذبات

۳۔ شہوات

۴۔ تعلقات

۵۔ رُوحِ ملکوتی یعنی نفسِ ناطقہ یا ضمیر جسے (Divine Spark) "شعلۂ روحانی" بھی کہتے ہیں۔

ضروریات اور عوامل کی یہی پانچ قسمیں انسان کے جبر کو عمل پر اُبھارتی ہیں اور انسان کا جسم حرکت میں آتا ہے اور اس سے مختلف اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ یہ پہلی چار قسمیں انسان کی طبیعت پر ایسا زور کرتی ہیں کہ عام انسان کا جسم ایسی حرکتیں کر گزرتا ہے، جس کی وجہ سے جسم کو نقصان پہنچ جاتا ہے یا اُسے پشیمان اور شرمندہ ہونا پڑتا ہے یا اُسے اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اور اس کی زندگی مصائب و آلام میں پھنس جاتی ہے۔ ان کے اندر خیر و شر کا شعور نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان کو اپنے مطالبات پورے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، ان کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ان کے مطالبات جس نہج سے پورے کئے جا رہے ہیں۔ وہ صحیح ہیں یا غلط، ان کو اگر زندگی کے کسی لائحہ عمل کا پابند نہ بنایا گیا ہو، تو انسان کو غلط راستوں پر لے جاتی ہیں اس لئے ہدایت و راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانچویں قسم یعنی انسان کا نفسِ ناطقہ جسے ضمیر بھی کہتے ہیں انسان کو اعلیٰ مقاصد کے لئے اُکساتا ہے، اس میں خیر و شر اور نیکی و بدی کی پہچان کی صلاحیت ہوتی ہے

اور یہ روحانی طور پر انسان کو خیر اور بھلائی کی طرف راغب بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ ضمیر انسانی اسے خیر کی طرف مائل تو کرتا ہے مگر یہ اُسے اس کا پابند نہیں کر سکتا کیونکہ انسان کو اپنے ارادہ اور اختیار میں آزادی دی گئی ہے۔ فَاِمَّا شَاکِرًا وَاِمَّا کَفُوْرًا چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کی شکر گذاری کا راستہ اختیار کرے۔ اور اگر چاہے تو کفرانِ نعمت کا طریقہ اختیار کر کے باطل راستوں کو اختیار کرے۔

انسان جب پہلی دفعہ اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کام کرتا ہے تو اُس کے دل پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اس کی روشنی گہنا جاتی ہے اور جب وہ مسلسل ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرتا ہے تو اس کا ضمیر سیاہ اور مردہ ہو جاتا ہے اور اس کے گناہوں کی سیاہی اُس کے دل کا نور چھین لیتی ہے ۔ انسان کے اس ضمیر کو زندہ طاقتور، اور بیدار رکھنے کے لئے اس کی خاص نگرانی کرنی پڑتی ہے اور اسے بھی صحیح راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے ؎

دلِ مُردہ، دل نہیں ہے اُسے زندہ کرو دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

خواہشات

انسان کے بدن کی نشو ونما اور اسے زندہ و برقرار رکھنے کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے اس کے نفس میں بھوک کی خواہش پیدا ہوتی ہے، غذا کے بغیر چونکہ انسان کے جسم کی زندگی خطرہ میں پڑ سکتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے منہ اور زبان میں ذائقہ کی چاشنی رکھ دی کہ کہیں انسان غذا کھانے سے انکار کر کے اپنی زندگی کو خطرہ میں نہ ڈال دے، جب کبھی بیماری کی بدولت انسان کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے تو وہ اچھی سے اچھی غذا کھانے سے بھی انکار کر دیتا ہے، چاہے اس کا پیٹ خالی ہی کیوں نہ ہو، یہ قوتِ ذائقہ ہی انسان

کو غذا کھانے کی ترغیب کا باعث بنتی ہے۔

جسم کو سردی اور گرمی سے بچانے کے لئے لباس کی خواہش پیدا ہوتی ہے، گھریلو زندگی کے لئے اسے مکان بنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان خواہشات کی تکمیل میں بھی اگر انسان اعتدال کو ملحوظ نہ رکھے اور بے اعتدالی کرنے لگے تو اس کی زندگی کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے، مقررہ اوقات میں غذا استعمال کرنے کی بجائے، ہر وقت چرتا چگتا رہے یا ضرورت سے زیادہ کھالے، زبان کے چٹخارے کو ہی مقصد قرار دے کر طرح طرح کے کھانوں سے دستر خوان کو سجانا شروع کر دے، سادہ لباس کی بجائے لباسِ فاخرہ استعمال کرنے لگے ضرورت کے رہائشی مکان کی بجائے عالی شان مکانات اور بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر کرنے لگے اور اس طرح غیر ضروری خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے حقوق پامال کرنے لگے تو وہ اپنی ان فطری خواہشات کو بھی سامانِ مصیبت بنا لیتا ہے، اس لئے اِن خواہشات کی تکمیل میں بھی انسان کو کچھ حدود کا پابند ہونا چاہیئے اور ان حدود کا صحیح علم بھی اُسے اسلام فراہم کرتا ہے۔

جذبات

اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کو خواہشات کے علاوہ گوناگوں جذبات سے بھی آراستہ کیا ہے، تاکہ انسان اپنی انسانی خصوصیات کا شاندار مظاہرہ کر سکے اور ان جذبات سے کام لے کر اپنی شخصیت اور خودی کو اس مقام تک پہنچا دے، جو اسے واقعی اشرف المخلوقات کا مصداق قرار دے دے۔ یہ جذبات مختلف قسم کے ہیں اور اُن میں سے ہر جذبہ انسان کی شخصیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ اس کے ہر جذبہ کی عکاسی اس کے چہرہ پر نمایاں ہوتی رہتی ہے اور اس کے چہرہ پر سے اس کے دل کے جذبات

کو بڑھا جا سکتا ہے۔ خوشی کی حالت میں یہ کبھی مسکرا رہا ہوتا ہے، کبھی ہنستا ہے کبھی قہقہے لگا رہا ہوتا ہے، کبھی آنکھوں سے اشارے کنائے کر رہا ہوتا ہے کبھی اس کا چہرہ مسرت سے دمدما رہا ہوتا ہے، کبھی وہ غصہ میں لال پیلا ہو رہا ہوتا ہے۔ کبھی اس کے چہرہ پر غم کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ کبھی اس کی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑی لگا رہی ہوتی ہیں۔ کبھی اس کے چہرہ پر سنجیدگی ہوتی ہے، کبھی وہ غور و فکر کے عالم میں ہوتا ہے۔ کبھی اس کے چہرہ پر پریشانی کے آثار ہوتے ہیں اور کبھی وہ سکون و قرار کی حالت میں ہوتا ہے اور یہ انسان کی امتیازی شان ہے جو دوسرے حیوانات میں نہیں پائی جاتی اور اگر پائی جاتی ہے تو معمولی اور برائے نام۔ یہ جذبات کون کون سے ہیں۔

محبت، اخوت، ہمدردی، احسان، نفرت، غصہ، عزتِ نفس، رشک کسبِ کمال، کسبِ رزق، شرم و حیا، غیرت و حمیت، عدل، جود و سخا، رحم و مودت وغیرہ۔

محبت

انسان کے اندر محبت کا جذبہ ایک نہایت قیمتی اور سنہری جذبہ ہے، دنیا کی رنگینیاں اور لطافتیں، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خوشگواریاں، شہروں اور دیہاتوں کی رونقیں اسی جذبہ محبت کے دم سے قائم ہیں، یہی محبت کا جذبہ انسانوں، جانوروں اور پرندوں کو اپنے بچوں کی پرورش پر مجبور کرتا ہے۔ اسی محبت کے جذبہ کی بدولت ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی اولاد کا پیٹ بھرتے ہیں، خود ننگے رہ کر اپنی اولاد کو بہترین لباس پہناتے ہیں، محنت اور مشقت کر کے ان پڑھ ماں باپ بھی اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں، یہی محبت اور مودت کا جذبہ میاں بیوی کو ایک نیا گھر بسانے پر آمادہ

کرتا ہے۔ اولاد کے دل میں اپنے ماں باپ کیلئے عزت و احترام ہوتا ہے۔ بھائی بہنوں اور رشتہ داروں میں محبت ہوتی ہے، خاندانوں، برادریوں اور ہم وطنوں میں محبت ہوتی ہے، مال و دولت سے محبت ہوتی ہے، کاروبار اور تجارتی اموال سے محبت ہوتی ہے، مکانوں اور جائداد سے محبت ہوتی ہے۔ یہ ساری محبتیں فطری محبتیں ہیں۔ مگر ایک مومن کے لئے ان سب سے بالاتر بھی ایک محبت ہوتی ہے اور یہ محبت اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت ہوتی ہے۔ ایمان والوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے" وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" ایمان والوں کی شناخت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ زیادہ محبت کرتے ہیں" اور وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کو فوقیت دیتے ہیں، اپنے تمام محبوب انسانوں کی محبت پر حتیٰ کہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد کی محبت پر بھی۔

ایک مومن کے دل میں خدا اور خدا کے رسولؐ کی محبت سب چیزوں سے زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باقی ساری محبتیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے تابع ہو جاتی ہیں اور ان سب محبتوں کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی رضا مندی کی خاطر قربان کیا جا سکتا ہے۔

ایک انسان جب اپنے اس محبت کے جذبہ کو بھی اس طرح پابند بنا لیتا ہے تو پھر اس کے لئے غیر اخلاقی محبتوں اور معاشقے لڑانے کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور وہ محبت کی ان بے اعتدالیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، جو اُسے غلط راستہ پر لے جا کر ذلیل و خوار کر دیتی ہیں اور وہ سوسائٹی میں منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہتا۔

یہی محبت انسان کے اندر، ہمدردی، احسان، رحم اور اخوت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، جو انسانیت کے لئے رحمت بن جاتے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت کے ساتھ اور اپنی اُمت کے ساتھ یہی گہرا رشتہ محبت تھا، جس نے رحمت کی صورت اختیار کر لی تھی اور اسی وجہ سے آپ کو یہ اعزاز دیا گیا کہ:

" وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" "وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ"

یہ رحمت کیا تھی، انتہائی ہمدردی، رحم اور بخشش، عفو و درگذر اور چشم پوشی وغیرہ پر مشتمل تھی، جس کی بناء پر آپ نے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی گالیوں کے جواب میں دعائیں دی تھیں، اُن سے پتھر کھا کر بھی اُن کو بددعائیں نہ دیں، اُن کی گھناؤنی سازشوں کے مقابلہ میں بھی جب فرمایا تو یہ فرمایا " اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ" اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کہ یہ علم نہیں رکھتے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

نفرت و غصّہ

انسان کے اندر ایک جذبہ " نفرت اور غصّے کا بھی رکھا گیا ہے، انسان جب اپنے گرد و پیش ناپسندیدہ حالات و واقعات دیکھتا ہے، جو اس کی طبیعت یا غیرت و حمیت کے خلاف ہوتے ہیں تو اس کے دل میں نفرت اور غصّے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ان جذبات کی بدولت وہ ناپسندیدہ حالات کو بدل دینا چاہتا ہے، ان جذبات کو بھی اگر تعمیری اور مثبت کاموں میں استعمال کیا جائے، تو یہ جذبات انسان کو شر اور بدی کے راستہ سے ہٹا کر خیر اور نیکی کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں اور ایک پاکیزہ ماحول پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں مگر ان جذبات کو اگر غلط طور پر اور بے احتیاطی سے استعمال کیا جائے تو یہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں اور انسان کی زندگی کا سکون چھین لینے کا باعث بن جاتے ہیں، اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان جذبات

نفرت کو بھی قابو میں رکھا جائے اور ان کو کہیں استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ایک ڈاکٹر کے سے ہمدردانہ اور خیر خواہانہ جذبہ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ جیسے ایک سرجن جب کسی بیمار کا اپریشن کرتا ہے تو صرف اس کے بیمار حصّہ پر ہی نشتر چلاتا ہے اور اس کے باقی جسم کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھتا ہے، اُسے صرف اس کی بیماری سے نفرت ہوتی ہے، اس کے جسم کا دشمن نہیں ہوتا ہے کہ اُسے بھی نقصان پہنچا دے۔ یہی نفرت کا جذبہ جب کہیں حد سے تجاوز کرتا ہے، تو انسانوں کے اندر باہمی دشمنی، بغض و عناد پیدا کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں فساد، جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں اور انسان کی زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام اس معاملہ میں بھی نفس کی صحیح صحیح راہنمائی کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو باہمی دشمنیوں اور کینہ پروریوں کو طول دینے سے روکتا ہے اور صلح جوئی کا حکم دیتا ہے، اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ایمان والے باہمی اختلاف کی بناء پر تین دن سے زائد ایک دوسرے سے سلام و کلام بند رکھیں۔ غصہ و نفرت کے مقابلہ میں صلح جوئی اور صلح پسندی بھی انسان کے دل کو بہت سی بے اطمینانیوں سے نجات دلا دیتی ہے۔

نفرت کے علاوہ غصّے اور اشتعال کا بے موقع اور غلط استعمال بھی انسان کی پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں اپنے گھر کے اندر، اپنے خاندان میں، اپنے سکول و کالج میں اپنے دوستوں اور محلے والوں میں، اپنے گاؤں اور شہر میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں، کہ اُسے دوسروں کی باتیں یا حرکتیں ناگوار گذرتی ہیں، انسان محسوس کرتا ہے کہ دوسرا غلطی پر ہے اور سراسر ناانصافی کر رہا ہے۔ ایسے مواقع پر غصّہ کا آنا ایک فطری بات ہے، خاص طور پر وہ

مواقع تو بہت نازک ہوتے ہیں، جب کسی کا جائز حق چھینا جا رہا ہو یا اُس پر کسی قسم کی زیادتی کی جا رہی ہو، ایسے حالات میں اگر انسان غصہ سے مغلوب ہو جائے اور مشتعل ہو کر ایسی حرکت کر بیٹھے جس کی بناء پر وہ مظلوم کی بجائے خود ظالم بن جائے تو اس کی زندگی کا سکون چھن جاتا ہے اور وہ ایسے مقدمات کی لپیٹ میں آجاتا ہے جو اس کے مال و جان اور کاروبار کی بربادی کا باعث بن جاتے ہیں ان حالات میں انسان اگر اپنے غصہ کو قابو میں رکھے اور اپنے دل کو کڑا کر کے ناگوار باتوں کو برداشت کرلے اور بدلہ لینے کی طاقت اور حق رکھتے ہوئے بھی بطور خود بدلہ نہ لے تو اس وقت انسان کو اگرچہ چند کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، مگر اس کے پھل بڑے میٹھے ہوتے ہیں اس لئے انسان کو غصے اور اشتعال کے مواقع پر اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی نہ صرف کوشش کرنی چاہیئے بلکہ عادت ڈالنی چاہیئے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "غصہ ایمان کو اس طرح خراب کرتا ہے جس طرح مصبر شہد جیسی میٹھی چیز کو بھی کڑوا کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے اجر کی بشارت دی ہے جو ایسی حالت میں اپنے غصہ کو ضبط کرلے، جب کہ وہ بدلہ لینے کی پوری قدرت رکھتا ہو، یہ بات درست ہے کہ انسان کو کسی زیادتی یا نقصان کے برابر بدلہ لینے کی اجازت دی گئی، مگر بدلہ لینے کی بجائے معاف کر دینے کی زیادہ خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمادیا ہے کہ معاف کرنے والے اور بدلہ نہ لینے والے کا اجر خود خدا کے ذمہ ہے اور یہ بڑی ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔

"وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

"اور ایمان والوں کو چاہیئے کہ اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے کے لئے اور اس کی جنت جس کی وسعتیں آسمان وزمین کے برابر ہیں حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں، جو بنائی گئی ہیں۔ اُن پرہیزگاروں کے لئے، جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ کھُلے اور چھُپے اور اپنے غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں ان احسان کرنے والوں کو۔"

(سُورہ آل عمران ۱۳۴)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے غصّہ کو پی جانے والوں اور لوگوں کی زیادتیوں سے درگذر کرنے والوں کو اپنی مغفرت اور جنّت کی بشارت دی ہے اور محسنین کہا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے دراصل یہ دنیا بھی امن و اطمینان اور سلامتی کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

عزّتِ نفس

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر رچا ہے وہ امیر ہے غریب ہے، مزدور ہے کارخانہ دار ہے، ان پڑھ ہے، تعلیم یافتہ ہے، مزارعہ ہے، زمیندار ہے، ماتحت ہے۔ افسر ہے، ملازم ہے، مالک ہے۔ ہر ایک میں عزّتِ نفس کا ایک جذبہ رکھا ہے جسے ہم خودداری یا (PRESTIGUE) بھی کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر انسان کو چونکہ ایک الگ اور مستقل یونٹ (UNIT) کی حیثیت حاصل ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ذاتی طور پر جواب دہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف قسم کی صلاحیتیں

دینے کے ساتھ ساتھ، شخصیت کی تعمیر و ترقی کا بھی ایک جذبہ دے دیا ہے،

جس کی بدولت

انسان اپنی سوسائٹی کے مختلف تعمیر شخصیت کرنے والے اداروں، اسکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں، ٹیکنیکل اداروں، مذہبی اور دینی درسگاہوں سے استفادہ کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے اور بعض لوگ خوب محنت کر کے اپنے آپ کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی اچھی اچھی مثالیں قائم کر جاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کو یہ جذبہ تعمیری مقاصد کے لئے عطا کر دیا ہے مگر کچھ لوگ اس جذبہ کی حقیقی قدر نہیں کرتے، وہ سست اور لاپرواہ رہتے ہیں یا غلط سوسائٹی اور لاپرواہ لوگوں کی مجلس اختیار کر کے اپنے تعلیمی زمانہ میں اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے میں ناکام رہتے ہیں اور سوسائٹی میں اچھا مقام، اچھا عہدہ، اچھا کاروبار حاصل نہیں کر پاتے تو وہ "احساسِ کمتری" میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کی بجائے، دوسروں کی ذات میں کیڑے نکالنے میں لگ جاتے ہیں، دوسروں پہ الزام تراشیاں اور جھوٹے بہتان لگا کر اُن کی عزت کو بزعم خود کم کر دینے کے شغل میں مصروف ہو کر اپنے احساسِ کمتری کے جذبہ کو تسکین دینے میں لگے رہتے ہیں، دوسروں کی چغلیاں کھاتے ہیں، عیب جوئیاں اور غیبتیں کرتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو بے اطمینانی میں مبتلا کئے رکھتے ہیں۔

اسلام نے انسان کو ان غلط حرکتوں سے روک کر اپنی شخصیت کی تعمیر و ترقی کی طرف متوجہ کر دیا ہے تاکہ وہ سوسائٹی میں باعزت اور باوقار مقام حاصل کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر سکے

رشک اور حسد کے جذبات

انسان کی عزتِ نفس اور تعمیرِ خودی کے جذبہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس میں "رشک" کا بھی ایک جذبہ رکھا ہے، جس کے تحت ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے یہ رشک کا جذبہ نہایت پسندیدہ جذبہ ہے، یہ جذبہ انسان کی شخصیت کی تعمیر میں مہمیز کا کام دیتا ہے اور انسان اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے، مگر جو لوگ غلط ماحول یا اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے محنت و مشقت نہیں کر پاتے، وہ دوسروں کو اچھے مقام و رتبہ پر دیکھ کر ان سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اس حسد سے وہ دوسروں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے خود اپنے وقار کو کم کر لیتے ہیں مثلاً آج کل بعض دکاندار اور تاجر دوسرے ہم پیشہ لوگوں کو مختلف طریقوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، دوسرے کے گاہکوں کو بد دل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، دوسروں کی اچھی چیزوں میں بھی سو عیب نکال دیتے ہیں اپنی گھٹیا چیزوں کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ اپنی دکان کو ترقی دینے کے لیے بہترین مال اور واجبی دام رکھیں، ناپ تول میں کمی کو ترک کر کے سچ بولنے کی عادت اختیار کر کے اپنے کاروبار کو فروغ دیں، دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں اور اس طرح دوسروں کے لیے بھڑکائی ہوئی آگ میں خود جلتے رہتے ہیں۔

یہ حسد انسان کے دل کی ایک ناپاک بیماری ہے جس سے لوگوں کے باہمی تعلقات ہی خراب نہیں ہوتے بلکہ اُن کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حسد کی تعریف یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت، مال دولت

علم و فضل، حسن و جمال، قوت و طاقت وغیرہ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہے اور اس کا بُرا چاہنے لگے۔ اس بُرا چاہنے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی یہ خواہش کرتا ہے کہ دوسرے کی یہ نعمت چھن جائے اور اُسے تکلیف و نقصان پہنچے دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کے خلاف بغض و عناد میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ناجائز حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری کو دل سے نکال دینے کی سخت تاکید فرمائی ہے، حضورؐ نے فرمایا "دیکھو حسد سے بچو! یہ نیکیوں کو اس طرح سے کھا جاتا ہے کہ جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

دِل کی یہ بیماری جسے حسد کہا جاتا ہے، انسان کے ذہن کی کئی بیماریوں کا پتہ دیتی ہے، گویا حسد کرنے والے کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ "اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے" اور کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت، تدابیر اور فیصلہ کے مطابق ہی ملا ہے۔ اس لئے اسلام نے جائز حدود میں رشک کرنے کی تو اجازت دے دی مگر حسد کرنے سے سختی سے روک دیا۔ تاکہ ہر انسان کامل یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل کی تلاش اور آرزو کر سکے اور دوسروں کے درپے آزار نہ رہے۔

عدل و انصاف

انسانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنے کا جذبہ بھی بہت قیمتی جذبہ ہے، یہی جذبہ انسانوں کو آپس کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کا صحیح شعور دیتا ہے اور انسانی معاشرہ کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ ایسی عدالتیں قائم کرے اور ایسے اجتماعی ادارے منظم کرے جو خدا کے نازل کردہ قوانین کے تحت لوگوں کے حقوق و فرائض سے متعلق فیصلے

صادر کرتے رہیں اور کسی قیمت پر بھی عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑیں، تاکہ لوگ اپنے حقوق کی حفاظت کے معاملہ میں مطمئن ہو کر اطمینان و سکون کی زندگی گذار سکیں۔

انسانی سوسائٹی میں فساد اور بگاڑ پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے، اپنے فرائض کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتا۔ آج اگرچہ عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین ادارے بھی قائم ہیں، ماتحت دیوانی عدالتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ فوجداری مقدمات کو نپٹانے کے لئے انتظامیہ بھی موجود ہے۔ مگر یہ ادارے اور انتظامیہ چونکہ اسلامی قوانین کے تحت فیصلے کرنے کی پابند نہیں ہے، اس لئے لوگوں کو صحیح انصاف ملنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں، پھر حصول انصاف کا طریق کار بھی بہت لمبا اور طویل ہے کہ کسی مقدمہ کے فیصلہ کے لیئے ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ صحیح عدل و انصاف اگر ہمیں مل سکتا ہے تو اس کا واحد ذریعہ اسلامی قوانین اور اسلامی نظام عدل ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے موجودہ سوسائٹی میں اگر کوئی شخص اطمینانِ قلب سے زندگی گذارنی چاہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ

وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائے۔

اپنے حقوق کی پاسداری دانشمندی اور صلح جوئی سے کرے۔

اپنے فرائض کی ادائیگی دیانتداری سے کرے۔

دوسروں کے حقوق کی حفاظت بھی احتیاط سے کرے تاکہ مقدمات کے چکر میں پڑنے سے نہ اس کا مال ضائع ہو، نہ وقت برباد ہو، نہ اس کا دل پریشان ہو۔ اگر

خدانخواستہ وہ کسی مقدمہ میں ملوث ہو بھی جائے تو نہایت وقار، حوصلہ اور تدبر سے کام لے اور اشتعال میں آکر نئے نئے مقدمات کی زد میں نہ آتا رہے۔ اسلام نے عدل و انصاف کے نظام کو قائم کرنے کی سختی سے تاکید کی ہے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی..."

"اللہ تعالےٰ تمہیں عدل و انصاف اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔"

عدل و انصاف سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حقوق و فرائض میں توازن قائم ہو، جس کو جو کچھ اور جتنا کچھ ملنا چاہیئے وہ اُسے ضرور ملے اور حقدار کو اس کا حق ملنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے، آقا اور ملازم میں، حاکم اور محکوم میں، گھریلو زندگی، شہری زندگی اور کاروباری معاملات میں جہاں میں جھگڑا پیدا ہوتا ہے اس کی اصل وجہ عدل و انصاف کو نظر انداز کرنا ہوتی ہے۔ پھر ہر شخص نے یہ بھی ایک عادت بنالی ہے کہ اپنی کوتاہیوں کی ذمہ داری بھی وہ دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔ اگر کوئی کام وہ عدل کے خلاف کرتا ہے تو اسے دوسروں کے طرزِ عمل کا ردِ عمل قرار دے کر خود کو بری کر لیتا ہے۔ اس طرح ساری سوسائٹی عدل و انصاف کے میزان سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اور لوگوں کے دلوں کا اطمینان رخصت ہو گیا ہے۔

شہوات

خواہشات اور جذبات کے بعد تیسرا نمبر شہوات کا ہے۔ یہی شہوت کا جذبہ انسانی نسل کی افزائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ جذبہ حیوانات کے اندر بھی موجود ہوتا ہے مگر پرندوں اور جانوروں کے بچے پیدا ہونے کے بعد جلدی ہی سنبھل

جاتے ہیں اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ اپنے ماں باپ کی مستقل نگرانی کے محتاج نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس انسان کی اولاد، پیدائش سے لے کر بلوغت تک اور بلوغت کے بعد بھی ماں باپ کی ہمہ وقتی نگہداشت اور پرورش کی محتاج ہوتی ہے، اس طرح انسان کو اپنے زمانۂ شیر خوارگی، اپنے بچپنے، اپنے زمانۂ تعلیم اور بلوغت تک کم و بیش ۲۰ سال ایک ایسے خاندان کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔ پیدائش کے بعد کس طرح ان کی مائیں ان کو گود میں لئے پھرتی ہیں، کس پیار و محبت سے انہیں دودھ پلاتی ہیں، نہلاتی دھلاتی ہیں، کپڑے پہناتی ہیں، ٹٹی پیشاب صاف کرتی ہیں، اس کی بیماری پر تڑپ تڑپ جاتی ہیں اور باپ اس دوران گھر کے اخراجات کی فراہمی کے لئے کمائی کی فکر میں رہتا ہے۔ ماں باپ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کی مشترکہ کوششوں سے کہیں پندرہ بیس سال بعد یہ نونہال اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوتا ہے اس طرح کی خاندانی زندگی انسان کی پرورش کے لئے لازمی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ شہوت کا جذبہ انسان کے اندر افزائش نسل اور خاندانی زندگی کو وجود میں لانے کی خاطر ہی رکھا گیا ہے اور مرد و عورت دونوں کے دلوں میں یہ ایک دوسرے کی طرف کشش اور پیار و محبت کا ایسا شدید جذبہ رکھا گیا ہے۔ جس کی بدولت ایک نوجوان لڑکی اپنے ماں باپ کے محبت بھرے گھر کو چھوڑ کر ایک نیا گھر آباد کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور عمر بھر کے لئے ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈال کر بچوں کی پرورش میں لگ جاتی ہے۔ اگر مرد و عورت کے دلوں میں پیار و محبت کا یہ جذبہ اتنی شدید صورت میں نہ رکھا جاتا، تو نہ ہماری خاندانی زندگی وجود میں آتی اور نہ ہمارے

بچوں کی صحیح پرورش ہو سکتی۔

انسانی شہوت کے اس جذبے کو انہی مقاصد کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور مؤثر بنانے کے لئے اسلام نے ایسی ہدایات دے دی ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اُن تمام خرابیوں اور مفاسد سے محفوظ رہ سکتی ہے، جو شہوت کے اس جذبہ کے بے جا اور غلط استعمال کرنے سے پیدا ہو گئی ہیں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جن قوموں اور ملکوں میں بھی اسلامی احکامات سے ہٹ کر آزاد شہوت رانی کے طریقے رواج پا گئے ہیں۔ ان کی خاندانی زندگیاں کس طرح تلپٹ ہو کر رہ گئی ہیں اور نئی نسل میں کیسی کیسی بُری عادتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

اس کے برعکس اسلام انسان کی شہوانی قوت (SEX ENERGY) کو کچھ اخلاقی ضابطوں کا پابند بنا کر اُسے آوارگی اور جذباتی ہیجان سے بچا لیتا ہے اور اُسے ایک پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، اسلام اپنی طرز معاشرت کا ایک ایسا نظام وضع کرتا ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے کام کرنے کے دائرے بڑی حد تک الگ کر دیئے گئے ہیں، مخلوط تعلیم اور مردوں عورتوں کے آزادانہ میل جول کو روک دیا ہے اور اُن تمام اسباب کا قلع قمع کر دیا ہے جو انسان کو ناجائز شہوت رانی کی طرف لے جاتے ہیں۔

شرم و حیا کا تحفظ

عورتوں میں صنفی کشش اور خواہش کا جذبہ مردوں کی نسبت زیادہ رکھا گیا ہے، اسی وجہ سے وہ ماں باپ کے گھروں کو قربان کر کے نئے گھر بسانے پر مجبور ہوتی ہیں، اللہ تعالے نے اُن کے اس جذبہ کو اعتدال پر رکھنے کے لئے اُن کی فطرت میں شرم و حیا کا بھی

ایک جذبہ رکھ دیا ہے جو اُن کے ضمیر میں یہ قوت پیدا کرتا ہے کہ اُن کی طبیعت غیر محرم مردوں سے آزادانہ میل جول اور صنفی میلان میں انقباض محسوس کرے اور اپنی صنفی مقناطیسیت کی فراوانی کے باوجود مردوں سے فرار اور تمانع کا اظہار کریں، چونکہ عورت کی شرم و حیا کا یہ جذبہ ہماری خاندانی زندگی کو بہت سے مفاسد سے محفوظ رکھتا ہے، اس لئے اسلام نے اس جذبہ کی حفاظت اور پاسداری کے لئے کئی اقدامات تجویز کئے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً

عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں رہنے کا پابند کیا گیا۔

عام مردوں سے اُن کے میل جول کو روک دیا گیا۔

غیر محرم مردوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

خوشبو لگا کر بازار جانے سے روکا گیا۔

چمکیلے لباس پہن کر اور میک اپ کر کے (Shopping) کے لئے نکلنے سے منع کیا گیا۔

غیر محرم مردوں سے علیحدگی میں بیٹھنے اور سفر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تاکہ ان کی عفت و عصمت کی پوری حفاظت ہو سکے اور ان کا خاندان عزت و احترام کی زندگی بسر کر سکے۔

غضِ بصر شرم و حیا کے جذبہ کی پاسداری کے اقدامات کے بعد دوسری ہدایت مردوں اور عورتوں کو یہ دی گئی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں، نگاہیں نیچی رکھنے کا مطلب و مدعا یہ ہے کہ نہ تو مرد اجنبی عورتوں کے حسن و جمال کی دید سے لطف اندوز ہوں اور نہ ہی عورتیں اجنبی مردوں سے ایسا طرزِ عمل اختیار کریں۔ فساد کی ابتدا چونکہ اسی دیدہ بازی سے ہوتی ہے، اس

لئے اسلام نے اس دروازہ کو بھی بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

عملی زندگی میں چونکہ یہ تو ممکن نہیں ہوتا کہ کوئی مرد کسی عورت کو یا کوئی عورت کسی مرد کو کبھی نہ دیکھے، اس لئے اسلام نے پہلی نگاہ کو تو معاف کر دیا ہے۔ البتہ جب کسی کو پہلی نگاہ میں حسن اور دلچسپی محسوس ہو تو ایک دوسرے پر دوبارہ نظریں گاڑنے اور گھورنے سے منع کر دیا گیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"جو شخص کسی اجنبی عورت کے محاسن پر شہوت کی نظر ڈالے گا، قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا"

غضِ بصر کے حکم کے بعد غیر محرم عورتوں کی رسیلی آوازوں اور گانوں سے کانوں کو لذت یاب کرنے سے بھی روکا گیا ہے، شہوانی جذبہ کے ساتھ اُن کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے پر بھی تنبیہہ کی گئی ہے۔ اور ان سب حرکتوں کو زنا کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے۔

حدیث پاک میں اس کی یوں وضاحت کی گئی ہے کہ
آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کی زنا نظر ہے۔
ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا دست درازی ہے۔
پاؤں زنا کرتے ہیں اور ان کی زنا اس راہ میں چلنا ہے۔
زبان کی زنا۔ لوچدار گفتگو ہے
دل کی زنا، تمنا اور خواہش کرنا ہے
اور آخر میں شہوانی اعضاء یا تو ان سب پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتے ہیں یا تکذیب۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے زنا کے محرکات کو کس باریک بینی اور دانش سے روکا ہے۔

اظہارِ زینت کی ممانعت

عورت کے دل میں حسن کی نمائش کا بھی ایک جذبہ موجود ہوتا ہے اور اُن کی نمائش حسن کی یہ خواہش ہمیشہ نمایاں اور جلی رہتی ہے اور یہی جذبہ اُن کے لباس کی تراش میں، بالوں کی آرائش میں باریک اور شوخ کپڑوں کے استعمال میں اور ان کی ناز و ادا کی حرکات میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اسلام نے عورتوں کی اس آرائش کو جو ہر بُری نیت سے پاک ہو، جائز آرائش قرار دیا ہے اور جس میں ذرا برابر بھی بُری نیت شامل ہو اُسے جاہلیت کی آرائش قرار دیا ہے اور اُسے تبرج جاہلیت کا نام دے کر اُس کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔

اسلام عورت کی ہر اُس زینت اور ہر اُس آرائش کو جس کا مقصد اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے لذتِ نظر بننا ہو۔ تبرج جاہلیت قرار دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر برقع اور چادریں بھی اس غرض کے لئے خوبصورت اور خوش رنگ استعمال کی جائیں کہ نگاہیں اُن سے لذت یاب ہوں تو یہ بھی منع ہیں۔ تبرج کی یہ اصطلاح دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ایک عورتوں کے حسن و جمال کے اظہار پر اور دوسرے چال (چلنے) میں ناز و ادا دکھانے، اٹھلانے، لچکے کھاتے، جسم کو توڑنے اور ایسی چالیں اختیار کرنے پر جن میں مختلف ادائیں پائی جاتی ہوں۔

اسلام سے قبل جاہلیت کے زمانہ میں بھی عورتیں خوب بن سنور کر گھروں سے نکلتی تھیں اور چال بھی قصداً ایسی اختیار کرتی تھیں کہ ان کے قدم زمین کو نہیں بلکہ غیر

مردوں کے دلوں کو متاثر کرتے تھے عورتوں کی ان حرکات سے چونکہ طرح طرح کے فتنے پیدا ہوتے تھے، اس لئے اسلام نے عورتوں کو اس کی بھی سختی سے ممانعت کردی۔

بدقسمتی سے آج ہمارے حالات کچھ بگڑ گئے ہیں۔ اسلام نے تو عورت کے لئے آخری حد کے طور پر اُسے بوقت ضرورت ہاتھ اور منہ کھلا رکھنے کی اجازت دی تھی اور ضروری حاجات کے لئے ہی گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی تھی، مگر ہم اس آخری حد سے اپنے سفر بے پردگی کا آغاز کرتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر اسلام نے رُک جانے کا حکم دیا تھا۔ ہماری خواتین شرم و حیا کو بالکل بالائے طاق رکھتے ہوئے، ہاتھ اور منہ ہی نہیں بلکہ:۔

خوبصورت مانگیں نکلے ہوئے کھلے سر

کندھوں تک ننگی باہیں ننگے بازو

باریک کپڑوں میں ملفوف نیم عریاں سینے

میک اپ سے مزین چہرے

غرضیکہ جسم کے تمام محاسن عام لوگوں کے سامنے پیش کردیئے جاتے ہیں تاکہ ان کی شہوانی پیاس کو تسکین ملے، بعض منچلے اسی آرائش اور زینت کے ساتھ اپنی بیگمات، بہنوں اور بیٹیوں کو دوستوں کی محفلوں میں لے آتے ہیں۔ اور انہیں غیروں کے ساتھ ہنسنے بولنے اور کھیلنے کی آزادی دے دیتے ہیں۔

اسلام نے عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی جو اجازت باپردہ محض اشد ضرورت کے تحت دی تھی اور کامل ستر پوشی اور وفاداری کی حالت میں دی تھی، اس کو جاذب نظر ساڑھیوں، نیم عریاں بلاؤزوں اور بے باک نگاہوں کے ساتھ، سڑکوں پر پھرنے۔

پارکوں میں ٹہلنے، ہوٹلوں کے چکر لگانے اور سینماؤں کی سیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے، اسلامی احکام کی ان کھلم کھلا خلاف ورزیوں کی وجہ سے ہمارے گھروں اور خاندانوں میں آئے دن نئے نئے فتنے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی بدولت ہماری زندگیوں کے سکون رخصت ہو گئے ہیں۔

پردہ کرنے کا حکم

مندرجہ بالا احکام کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورتوں کو پردہ کا حکم دیا ہے اس میں چہرہ کا پردہ بھی شامل ہے۔ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت نہیں دی گئی ہے کیوں کہ انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے اور حقیقت میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہی نگاہوں کو سب سے زیادہ کھینچتا ہے، جذبات کو سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے اور صنفی جذب و انجذاب کا سب سے طاقتور ایجنٹ ثابت ہوتا ہے۔ اسی لئے عورتوں کو خاص طور پر اپنا چہرہ چھپانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اسلامی سوسائٹی شہوانی فتنوں سے محفوظ رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے اس پردہ کے واضح احکام نازل فرمائے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (سورہ الاحزاب ۵۹)

"اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائے گا۔

قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر میں مشہور مفسّرِ قرآن صحابی حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا کریں۔"

گویا ان کے نزدیک یہاں پر مقصود چہرہ کو چھپانا ہے، خواہ وہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے، نقاب سے چھپایا جائے، کسی اور طریقے سے چھپایا جائے۔

نکاح کی سہولت

اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لئے عورتوں اور مردوں میں شہوت کا یہ جذبہ رکھا تھا، اُن کی تکمیل کے لئے نکاح کا دروازہ کھول دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم اپنی شہوانی ضروریات کو صرف نکاح کے معروف طریقہ سے ہی پوری کر سکتے ہو۔ چوری چھپے یا بے ضابطہ تعلقات کے ذریعہ سے نہیں بلکہ باقاعدہ اعلان اور اظہار کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد ہی پوری کر سکتے ہو، تاکہ سوسائٹی میں یہ بات معروف اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد و عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں، اس طرح کے نکاح کے ذریعہ جب مرد و عورت میاں بیوی بن جاتے ہیں تو پھر ان کا یہ تعلق بھی ایک عبادت بن جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"تم کو نکاح کرنا چاہیئے کیوں کہ وہ آنکھوں کو بد نظری سے روکنے اور شرمگاہ کی حفاظت کی بہترین تدبیر ہے اور جو شخص تم میں سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو، وہ روزے رکھے، کیوں کہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔"

(باب النکاح - ترمذی)

"جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے، اور اس کے حسن سے متاثر ہو، تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے، کیوں کہ اس کے پاس بھی وہی کچھ ہے جو اس کے پاس تھا۔"

زنا کی حرمت

اسلام نے اس نکاح کی جائز صورت کے علاوہ شہوت رانی کے بقیہ تمام طریقوں کو حرام کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا

(سورہ بنی اسرائیل۔۳۲)

"زنا کے پاس تک بھی نہ پھٹکو کیوں کہ وہ بے حیائی ہے اور بُرا راستہ ہے۔"

اسلامی نقطۂ نظر سے زنا کا فعل اجتماعی زندگی کے ان عظیم ترین جرائم میں سے ایک ہے، جو انسانی تمدن کی عین بنیاد پر حملہ کرتا ہے۔ اسی لئے زنا کو قابلِ تعزیر جُرم قرار دیا گیا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ نور۔۲)

"زناکار مرد اور زناکار عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور قانونِ الٰہی کے معاملہ میں تم کو ان پر ہرگز رحم نہ کھانا چاہیے۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، اور جب ان کو سزا دی جائے تو مسلمانوں میں سے ایک جماعت اس کو دیکھنے کے لیے حاضر رہے۔"

انسان کے شہوانی جذبات کو ایک ڈسپلن کا پابند بنانے کے لئے اسلام نے

جتنے احکام بھی دیئے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ اس کے اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہواتی ہیجانات اور محرکات سے پاک رکھا جائے، تاکہ انسان کو ایک ایسا پاکیزہ اور پُر سکون ماحول میسر آجائے جس میں وہ اطمینان کے ساتھ اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اس انتشارِ فکر و عمل سے محفوظ رہے جو شہوت کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینے سے پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے۔ کیا اسلامی نظامِ زندگی کے سوا کوئی اور مذہب یا نظریہ بھی انسان کے شہوانی جذبات کو اس طرح منضبط رکھنے کا کوئی پروگرام رکھتا ہے۔

تعلّقات

انسان کے نفس کی چوتھی ضرورت اجتماعی زندگی کے تعلقات ہیں۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ مل کر اُس نے زندگی گذارنی ہے اُن کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے رہیں، گھر میں بھی وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ ہنسی خوشی سے رہیں، گھر سے باہر بھی وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ دوستوں کی محفلوں بازاروں اور دفتروں میں جہاں بھی وہ ہو اور جن لوگوں کے ساتھ بھی اُسے واسطہ پڑے ان سے تعلقات اچھے رہیں، ان اچھے تعلقات میں ہی وہ اپنی بھلائی سمجھتا ہے۔ اس لیے ان تعلقات کے معاملہ میں بھی اسلام نے اُس کو بہترین راہنمائی کی ہے۔ جس کے مطابق عمل کرنے سے اس کی زندگی خوشگوار رہتی ہے۔

ان تعلقات کے سلسلہ میں اسلام کے زرّیں اصول یہ ہیں۔

پہلا اصول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا اصول یہ بتایا ہے۔
"وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدُہٗ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ"

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے"!

جس طرح آپ یہ گوارا نہیں کرتے کہ آپ کے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچے آپ کو کوئی تکلیف یا نقصان پہنچانے کے درپے ہو، آپ کی کوئی بے عزتی کرے آپ کو کوئی فریب دے، آپ کا کوئی مذاق اڑائے، آپ سے کوئی بے رُخی برتے، آپ کے نقصان پر خوش ہو۔ بالکل یہی جذبات دوسروں کے بھی ہوتے ہیں، آپ ان کے جذبات کا خیال رکھیں گے تو آپ کے جذبات کا بھی خیال رکھا جائے گا۔

دُوسرا اصُول

خیر خواہی و ایثار۔ آپ کے طرزِ عمل سے دوسرے کبھی یہ محسوس نہ کریں کہ آپ ان کی بدخواہی میں ہیں، بلکہ یہ محسوس کریں کہ آپ ان کے خیر خواہ ہیں، اگر آپ دوسروں کی عزتِ نفس یا وقار کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت نہ کریں گے تو دوسرے بھی آپ کی عزت کریں گے، آپ کا وقار بلند ہوگا اور آپ امن میں رہیں گے اسلام نے ہر شخص پر دوسرے کا یہ حق قائم کر دیا ہے کہ وہ اس کی خیر خواہی کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ایک مرتبہ صحابہؓ کے سامنے تین بار ارشاد فرمایا کہ:-

"الدِّين نَصِيحَة" "دین اسلام سراسر خیر خواہی ہے"

اس خیر خواہی کے ساتھ اگر انسان ایثار کو بھی شامل کرلے اور دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دینے لگے، خود تکلیف اٹھالے اور دوسرے کو آرام پہنچائے خود بھوکا رہے اور دوسرے کا پیٹ بھر دے، خود زحمت اٹھاکر دوسرے کو تکلیف سے بچالے، اپنی ضرورت کو روک کر دوسرے کی ضرورت پوری کرے۔ تو یہ بڑی سعادت کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے دل کو بھی اطمینان سے سرشار رکھتا ہے۔

تیسرا اصُول

عدل واحسان تعلقات کی بہتری کے لئے تیسرا اصول یہ بتایا گیا ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں بھی عدل وانصاف سے کام لے، خود بھی اپنے حق سے زائد وصول کرنے کی کوشش نہ کرے، دوسروں کو پیچھے دھکیل کر خود آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے اور چھینا جھپٹی سے کام نہ لے۔

احسان یہ ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کریں، انہیں ان کے حق سے بھی زیادہ دینے کی کوشش کریں، آپ کے دل میں یہ گنجائش موجود ہونی چاہیئے کہ دوسروں کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرسکیں، اُن کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرسکیں۔ آپ اُن کی خاطر اپنا کچھ حق چھوڑ دینے پر بھی تیار رہیں۔

عدل کے ساتھ ساتھ احسان کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ محض عدل سے کسی معاشرہ میں خوشگوار فضا نہیں پیدا کی جاسکتی، جہاں یہ عالم ہو کہ ہر شخص ہر موقع پر ناپ تول کر یہ دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق بنتا ہے اور وہ اسے ہر قیمت پر وصول کرکے ہی چھوڑے گا، چاہے اُسے لڑائی جھگڑا کرنا پڑے یا مقدمہ بازی کرنی پڑے

تو اس طرح معاشرہ میں خوشگواری پیدا نہیں ہو سکتی۔

عدل بلا شبہ ضروری ہے، حق و انصاف کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں لیکن کام صرف عدل کے تقاضے پورے کرنے سے نہیں چل سکتا، جب تک لوگوں میں اپنا کچھ چھوڑ دینے اور دوسروں کو ان کے حق سے کچھ زیادہ دینے کی گنجائش نہ ہو تعلقات کی خوشگواری کی خاطر ہر شخص کو کچھ نہ کچھ احسان کی روش ضرور اختیار کرنی چاہیئے، کیوں کہ اس محبت اور شکر گذاری کی فضا میں ہی انسان کو اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:۔

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی"

"اللہ تعالیٰ تمہیں عدل کرنے، ایک دوسرے سے احسان کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر مبنی آیات کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی نمازِ جمعہ ادا کی جا رہی ہوتی ہے، ہر خطیب اپنے خطبۂ جمعہ میں ان آیات کے ذریعہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پابندی کرنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیثِ قدسی روایت ہے کہ:۔

اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ — میرے رب نے مجھے باتوں کا حکم دیا ہے

۱۔ خَشْیَةِ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ — کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں۔

۲۔ وَکَلِمَةُ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا — کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف

غصہ میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں۔

۳۔ وَالْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنَاءِ — خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت میں بہر حال راستی اور اعتدال پر قائم رہوں۔

۴۔ وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِيْ — اور یہ کہ جو کوئی مجھ سے کٹے میں اُس سے جُڑوں۔

۵۔ وَاُعْطِيْ مَنْ حَرَمَنِيْ — اور جو مجھے محروم کرے میں اُسے دوں

۶۔ وَاَعْفُوْا مَنْ ظَلَمَنِيْ — اور جو مجھ پر زیادتی کرے میں اُسے معاف کروں۔

۷۔ وَاَنْ يَكُوْنَ صَمْتِيْ فِكْرًا — اور میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو

۸۔ وَنُطْقِيْ ذِكْرًا — اور میری گفتگو ذکرِ الٰہی کی گفتگو ہو

۹۔ وَنَظْرِيْ عِبْرَةً — اور میری نگاہ، عبرت کی نگاہ ہو

اللہ کے رسولؐ نے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اسی ضابطۂ اخلاق کی بدولت اپنے جانی دشمنوں تک کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور کافروں کی زبانوں پر کلمہ لاالٰہ الااللہ محمدؐ رسول اللہ جاری ہو گیا تھا۔ ان ہدایات کے ساتھ ساتھ بعض تعلقات کے بارے میں اسلام نے واضح احکامات بھی دیئے ہیں۔

ماں باپ کا احترام

ہر انسان کا پہلا تعلق اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلام نے ماں باپ کے ادب و احترام کی بڑی تاکید

کی ہے اور یہ اسلام ہی کی برکت ہے کہ ہماری سوسائٹی میں بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کا احترام کیا جاتا ہے، ورگرنہ مغربی ملکوں کے اندر بوڑھے ماں باپ کا احترام ختم ہوکر رہ گیا ہے اور جب کوئی ماں باپ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے اور کمانے کے قابل نہیں رہتا تو انہیں بوڑھا خانوں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی اولاد کا منہ دیکھنے اور ان سے بات چیت کرنے کے لئے ترس جاتے ہیں اُن کی اولاد کو اس مشینی دور کی مصروفیات میں اور معیارِ زندگی کی بلندی کے چکر میں ان کی خبر گیری کرنے اور اُن سے ملاقات کے لئے جانے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

"وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ط (پارہ ۲۱ سورۃ لقمان)

"ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے حق میں تاکیدی حکم دیا (کہ ہر حال میں اُن کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں) کہ اس کی ماں نے جھٹکے پر جھٹکے کھا کر اس کو پیٹ میں رکھا، پھر کہیں دو برس بعد اس نے دودھ پینا چھوڑا (اس لئے ہم نے حکم دیا کہ) وہ ہمارا بھی شکر گزار رہے اور (اپنے ماں باپ کا بھی"

پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا۔

"إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ○

"اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کے آگے ہوں بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور اُن سے بات چیت ادب کے ساتھ کرنا"

پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا

"وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل ۴)

"اپنے ماں باپ کے سامنے محبت اور انکساری کے ساتھ اپنے پہلوؤں کو ان کے آگے جھکائے رکھنا اور اُن کے حق میں دُعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا پوسا اور مجھ پر رحم کرتے رہے اسی طرح تو بھی اُن پر اپنا رحم کرنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:۔

"جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اس کی عمر دراز ہو، اس کے رزق میں برکت ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے اور ان کی صلہ رحمی کرے"

پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

"جو کوئی یہ چاہے کہ قبر میں اپنے باپ کو آرام پہنچائے اور خدمت کرے تو باپ کے انتقال کے بعد اس کے بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور والدہ کے انتقال کے بعد اپنی خالہ اور والدہ کی سہیلیوں سے اچھا برتاؤ کرے"

شوہر و بیوی کا تعلق

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اس کی ضروریات حسبِ حیثیت پوری کرتا رہے۔ حضرت عمر ابن الاحوص روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "عورتوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے میں میری نصیحت قبول کرو، اس لئے کہ وہ تمہارے پاس مقید رہتی ہیں، تم

اس کے سوا اُن کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو، الّا یہ کہ وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں، اس طرح تم انہیں بستروں پر الگ چھوڑ دو (یعنی ان سے الگ ہو کر سو جاؤ) اور انہیں اس طرح مارو کہ وہ تکلیف ان کے لئے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر ظلم کا کوئی راستہ اختیار نہ کرو، یاد رکھو! تمہاری بیویوں پر تمہارا کچھ حق ہے۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے، کہ وہ تمہارے بستروں کو ایسے لوگوں سے پامال نہ ہونے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور نہ ایسے لوگوں کو تمہارے گھر آنے کی اجازت دیں، جو تمہیں ناپسند ہوں، یاد رکھو! ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اُن کے کپڑوں اور اُن کے کھانے میں اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔"

حضرت اُمِّ سلمٰیؓ روایت کرتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"جس عورت کا انتقال اس حالت میں ہو کہ اس کا شوہر اُس سے راضی ہو وہ جنّت میں جائے گی۔" (ترمذی، ابنِ ماجہ)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"جو عورت پانچوں نمازیں پابندی سے پڑھے، رمضان کے مہینے کے روزے رکھے، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنّت کے جس دروازے سے تو داخل ہونا چاہے داخل ہو جا۔"

(احمد، نسائی)

اسلام نے ماں باپ کی اطاعت اور میاں بیوی کے باہمی حُسنِ سلوک کے بعد اپنے قریبی رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کو فوقیت دی ہے اور پڑوسیوں اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی اور بھلائی کا بھی حکم دیا ہے۔ تاکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ سمجھے اور اس کی زندگی اطمینان سے بسر ہو۔

باب دہم

رُوحانیت یا رُوحِ ملکوتی

انسان کے جسم کے عناصرِ ترکیبی کی بحث میں روح کی عظمت کے ضمن میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ انسان کے جسم اور نفس میں روح کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور انسان اگر روح کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے تو وہ محض حیوانِ ناطق بن کر رہ جاتا ہے اور اگر رُوح کے تقاضوں کو بھی پورا کرے تو وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام کو پا لیتا ہے۔ اس لئے انسان کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف اس کے جسم اور نفس کے تقاضے پورے کرتا ہو بلکہ رُوح کے تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہو۔ دنیا میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی جسم کے ان تینوں عناصر کی ضروریات کو نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ پوری کرتا ہے اور اس کی روحانیت کی تسکین کے لئے بھی بہترین طریقے استعمال کرتا ہے۔

رُوحانیت کا اسلامی تصوّر

روح کی حقیقت اور اس کی خصوصیات پر ہم اس کتاب کے باب نمبر ۴ میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں، اب ہم روحانیت کا اسلامی تصور پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ روحانیت کے تصوّر اور اس کے مفہوم کے متعلق بھی مسلمانوں میں مختلف قسم کے خیالات اور ذہن پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ پریشان فکری

میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے روحانیت کے متعلق ان مختلف خیالات اور طریقوں کا تجزیہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ہمارا ذہن اس معاملہ میں بھی صاف ہو جائے۔

اسلام کا روحانی تصور ان خیالات کی ہرگز تائید نہیں کرتا ہے جو دوسرے غلط مذاہب کے راہبانہ تصور ASCETIC VIEW OF LIFE میں سے مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئے ہیں کہ انسان دنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے مراقبہ (Meditation) اور مجاہدہ (SPIRITUAL EXERCISE) کے ذریعہ اپنی اندرونی قوتوں کو ترقی دے کر کشف اور کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرلے اور اس پر خود بھی خوش رہے اور دوسرے لوگوں پر اپنا رعب قائم کرے اس دنیا کو انسان کے لئے قید خانہ اور جسم کو روح کے لئے قفس قرار دیتا ہو اور ایک گوشہ یا کسی خانقاہ میں بیٹھ کر پہلوان کی طرح ذہنی ورزشیں کرکے اپنی قوتِ ارادی کو بڑھانے اور اس کے زور سے دنیا کو شعبدے دکھانے لگے۔

پھر اسلام کا روحانی تصور یہ بھی نہیں ہے کہ انسان اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کی پوجا پاٹ کے لئے الگ کرلے اور اس تھوڑے سے وقت میں عبادت کی چند رسوم ادا کرکے یہ سمجھ لے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے اور اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں۔

اسلام کا روحانی تصور یہ بھی نہیں ہے کہ خدا کا کوئی بندہ صبح و شام آکر اُسے جُھک جُھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد اس کے احکام کی خلاف ورزی میں جہاں چاہے پھرتا رہے اور جس کی چاہے نوکری یا غلامی کرتا رہے یا وہ دنیا کے معاملات اور ذمہ داریوں کو ملکی معاملات کو سیاست قرار دے کر ان سے الگ تھلگ رہے اور خدا کے سامنے محض ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونے اور صبح و شام اُس کو آقا آقا

کہتے رہنے پر ہی اکتفا کرلے اور اس کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ خدا کی مخلوق کو خدا کے باغی اپنا غلام بناتے چلے جارہے ہیں اور خدا کا دین کمزور اور مغلوب ہوتا جارہا ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا تصور روحانیت یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو اور وہ اپنے آپ کو خدا کا دائمی اور ہمہ وقتی ملازم (Whole Time Servant) سمجھے اور اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت اور یاد سے خالی نہ ہو۔ اس کا سونا اور جاگنا، اس کا کھانا اور پینا، اس کا چلنا اور پھرنا، غرضکہ سب کچھ خدا کے قانون شریعت کے مطابق ہو اور وہ طریقت کے چکر میں پڑ کر اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے آزاد نہ کرلے اور خدا کی زمین اور خدا کے بندوں سے الگ تھلگ ہو کر انہیں خدا کے باغیوں کے حوالہ نہ کردے بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کبھی غافل نہ ہو

روحانیت کا حقیقی مفہوم

چنانچہ قرآن وحدیث کے مطالعہ، صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعین کے طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام کے نزدیک روحانیت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ:۔

"انسان کی رُوح اس کی حیوانیت پر اس طرح قابو پالے، کہ پھر زندگی کے کسی گوشے میں اس کو حیوانی خواہشات اور نفسانی جذبات کسی حالت میں بھی اس کی رُوح پر غالب نہ آسکیں، بلکہ اس کی رُوح اُس کی ان خواہشات و جذبات کو

کو اس طرح زیر کرے کہ کوئی بڑے سے بڑا خوف و لالچ یا نفع و نقصان بھی اسے اطاعتِ الٰہی اور حدود اللہ کی پابندی و احترام سے نہ ہٹا سکے اور دنیا کی سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر اپنا جان و مال اور سب کچھ جو اللہ نے اُسے دے رکھا ہے ، دینِ حق کی سربلندی کے لئے وقف کر دے ، یہی کمال انسانیت اور کمالِ عبدیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو انسان کے لئے عظیم کامیابی (اَلْفَوْزُ الْعَظِیْم) قرار دیا ہے اور یہی حقیقی روحانیت ہے۔"

اسی روحانیت کی شمع روشن کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دین اسلام کی سربلندی کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ مقدس جماعت تیار کی تھی، جس کی کوششوں کے نتیجہ میں ایک مثالی اسلامی ریاست (STATE) قائم ہو گئی تھی ، جس نے خلافتِ راشدہ کا وہ بابرکت نظام قائم کر دیا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے آخر الزمان پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا۔ اس خلافتِ راشدہ کے مقابلہ میں ہر قسم کی آمریت اور ملوکیت دم توڑ کر رہ گئی اور اس بابرکت اسلامی نظام حکومت نے بڑے بڑے شہنشاہوں ، قیصر و کسریٰ کی (SUPER POWERS) کے تخت الٹ کر رکھ دیئے تھے اور ملکوں کے ملک اپنی کثیر آبادیوں سمیت اسلامی حکومت کے زیر نگیں آ گئے تھے اور جس کی بدولت آج بھی روئے زمین پر تقریباً ۹۰ کروڑ انسان حلقہ بگوشِ اسلام ہیں اور ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مگر اُس وقت چونکہ لوگ ایک طرف فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور ملکوں پہ ملک فتح ہو رہے تھے اور دوسری طرف ذرائع آمد و رفت اور ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے برابر تھے ، کاغذ چھاپہ خانے ، اور پیغام رسانی کے ذرائع

بھی تاحال ایجاد نہ ہوئے تھے جن کی مدد سے اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی صحیح تربیت کی جاسکتی یا انہیں اسلامی تعلیم سے آراستہ کر لیا جاتا اور دور دراز کے ممالک کے نظم کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے اس لئے کم و بیش چالیس سال[1] کے بعد خلافت راشدہ کا معیاری اسلامی نظامِ حکومت پھر ملوکیت کی طرف لڑھک گیا اور تختِ سلطنت پر ایسے افراد متمکن ہو گئے جن کی اپنی زندگیاں، اسلامی زندگی کا کامل نمونہ نہ تھیں، اور اگرچہ وہ دینِ اسلام پر ایمان لانے کے دعویدار تھے مگر دین اسلام کو نظمِ مملکت میں دخل دینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس طرح مذہب اور سیاست میں تفریق پیدا ہونا شروع ہو گئی اور نظمِ مملکت پھر ایسے رؤسا اور اعیانِ سلطنت کے ہاتھوں میں آگیا جو اسلامی علوم اور اسلامی کردار سے کماحقہٗ بہرہ ور نہ تھے۔

حکومت کا قانون چونکہ اسلامی تھا اور معاشرہ کی اقدار و روایات بھی اسلامی تھیں اس لئے بادشاہوں نے مملکت کی ضروریات کے تحت تو فقہائے عظام، علمائے کرام اور مشائخِ عظام کی خدمات سے استفادہ کیا مگر حکومت میں انکی وہ قدر و منزلت نہ رہی جس کے وہ مستحق تھے اس کے باوجود ہر زمانہ میں مجاہدینِ اسلام، علمائے حق اور صلحائے امت نظمِ مملکت کو دوبارہ اسلامی دستور کی بنیادوں پر قائم کر دینے کی کوشش کرتے رہے اور اس راستہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی اور اپنے گھر والوں کی جانوں کے نذرانے بھی پیش کئے اور علمائے ربانی نے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں، کہیں ان

---

[1] دنیا میں آج تک اشتراکیت یا جمہوریت یا کوئی اور نظام ایسا نہیں ہے جو اپنی مثالی شکل میں ایک دن کے لئے بھی قائم ہوا ہو، یہ اسلامی نظام حکومت کو ہی خصوصیت حاصل ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے دور میں قریباً چالیس سال تک مثالی صورت میں قائم رہا ہے۔

کو اپنی اس جدوجہد میں کامیابی ہوئی اور کہیں نہ ہوئی مگر یہ جدوجہد آج تک جاری ہے اور جاری رہے گی۔

تصوّف

مذہب اور سیاست کی اس علیحدگی کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی میں جو بگاڑ پیدا ہو رہے تھے، ان کی اصلاح اور عام مسلمانوں کا تعلق اسلام سے وابستہ رکھنے اور غیر مسلموں تک دعوتِ اسلام پہنچانے کے لئے ہمارے مشائخ بزرگوں نے مختلف طریقے اختیار کئے اور روحانیت کے تحفظ اور پرورش کے لئے بھی ایک خاص طریقہ اختیار کیا جسے "تصوّف" کہا جاتا ہے۔ یہ تصوّف کا طریقہ دوسری صدی ہجری یعنی دورِ صحابہؓ سے قریباً ڈیڑھ سو سال بعد اس وقت شروع ہوا، جب علمائے حق مذہب اور سیاست کو دوبارہ یکجا کرنے میں مایوس ہو گئے۔

ابتدا میں عبادت سے زیادہ شغف رکھنے والوں کو "عابد و زاہد" کہا جاتا تھا، جو زیادہ وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اور دنیا سے زیادہ تعلق نہ رکھتے تھے۔ جب تصوّف کی یہ اصطلاح وجود میں آئی تو پہلی صدی ہجری کے اُن لوگوں کو بھی "صوفی" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، جو اپنی عبادت اور زہد کی وجہ سے مشہور تھے۔ تصوّف کے اس طریقہ میں بھی کئی غلط خیالات و اعمال رواج پا گئے، جن کی وجہ سے روحانیت کی پرورش کا یہ طریقہ بھی اسلام کے حقیقی تصورِ روحانیت سے مطابقت نہ پیدا کر سکا۔ کیوں کہ مذہب اور روحانیت کا محدود تصور پیدا

ہو جانے کی وجہ سے ہمارے مشائخ اور پیر صاحبان بھی دنیا کے مسائل سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر اپنی اپنی خانقاہوں میں اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرنے میں لگ گئے جیسے اُن کے خدا کو کچھ خوبصورت شیشے کے برتن، کچھ عمدہ گراموفون اور لاؤڈ سپیکر، کچھ لطیف ریڈیو سٹ اور فوٹو کے کیمرے درکار تھے، جو عالم غیب کی آوازیں سُن سکیں یا خدا کے حسنِ مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے اور ان کی تصویریں کھینچ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو سکیں۔

تصوف کے اس غلط تصور کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ پاکیزہ کردار و اخلاق کے لوگ زندگی کے میدانوں کو چھوڑ کر گوشوں میں چلے گئے اور گھٹیا کردار کے لوگوں کے لئے تمدن و سیاست کا میدان خالی ہو گیا۔ ہر قوم نے چھانٹ چھانٹ کر بڑے بڑے مجرموں کو اپنا لیڈر اور سربراہ بنا لیا۔ اگرچہ یہ لوگ مذہب کے منکر تو نہیں تھے مگر ان کے نزدیک مذہب ہر انسان کا شخصی اور انفرادی معاملہ بن کر رہ گیا تھا اور اسے معاملاتِ ملکی سے خارج کر دیا گیا تھا۔

صُوفی کی وجہِ تسمیہ

تصوف سے متعلقہ کتب میں لفظ "صوفی" کی وجہِ تسمیہ میں کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) صوفی یا صوفیوں کو اہلِ صُفّہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (صفہ یعنی چبوترہ اونچی جگہ جو آج بھی مدینہ شریف میں مسجدِ نبویؐ کے احاطہ میں بطور یادگار موجود ہے) یعنی وہ صحابی رضؓ جو بے گھر تھے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائگی میں آپ کے حجرۂ مبارک کے قریب ہی اپنا ڈیرہ جما رکھا تھا، جو لوگوں کی امداد و اعانت سے اپنا پیٹ پالتے تھے، مگر کسی کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلاتے تھے اور یہ فقراء کے نام سے مشہور تھے۔ صُفّہ کی نسبت سے ان کا نام صفّی ہونا چاہیئے تھا

صوفی نہیں ہوسکتا تھا۔

(۲) صوفی کا لفظ صَفا سے لیا گیا ہو، یعنی ایسا شخص جو صفائی، نیک نیتی، صاف باطنی اور پاکیزگی کا حامل ہو۔

(۳) صُوفی کا لفظ صُوف کی طرف منسوب ہو، جس کے معنی موٹے جھوٹے اُونی کپڑے کے ہیں، چونکہ صوفیوں اور زاہدوں نے پرانے عیسائی راہبوں کی طرح موٹے کپڑوں کے استعمال کو اپنا شعار بنا لیا تھا جس کی وجہ سے ان کو صوفی کہا جانے لگا۔

۴۔ صوفی یونانی لفظ سُوفیا سے لیا گیا ہو جس کے معنی طب اور حکمت کے ہوتے ہیں۔ مگر یونانی اس لفظ کو طبیبوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

۵۔ صُوفی، صُوفہ کی طرف منسوب ہو، جو زمانۂ جاہلیت کے ایک شخص غوث بن مُر کا لقب تھا، جو شب و روز خدا کی عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ اس کی اولاد اس لقب کی نسبت سے صوفی کہلائی، شیخ شمس الدین عبدالرحمٰن جوزیؒ نے اپنی مشہور کتاب تلبیس ابلیس میں یہی وجہ بتائی ہے۔ مگر پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں میں اس لفظ کے استعمال کا کہیں ثبوت نہیں ملتا ہے۔

پہلا صُوفی پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا وہ السید ابوہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ جس کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا۔ اسی طرح پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اور وساوس اور خطرات پر بحث کی اور تصوّف کو ایک علمی شکل میں پیش کیا وہ حارث بن اسد محاسبی تھا، یہ مال اور مالداروں کے سخت مخالف تھے انہوں نے اپنے والد کی جائداد محض اس احتیاط کی بنا پر نہ لی کہ وہ رافضی العقیدہ تھے۔ پھر دوسری اور تیسری صدی ہجری میں

کئی ایسے بزرگ پیدا ہوئے جنہوں نے توحیدِ الٰہی، معرفتِ نفس، فقر و فاقہ، توکل صبر و رضا، افلاس و استقامت اور ترکِ دنیا وغیرہ مسائل پر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا۔

حضرت ذو النون مصریؒ (وفات ۲۲۵ھ) حضرت سقطی بغدادیؒ (وفات ۲۵۹ھ) حضرت جنید بغدادیؒ (وفات ۲۹۸ھ) حضرت بایزید بسطامیؒ (وفات ۲۳۶ھ) وغیرہ بزرگوں نے اپنے اپنے زمانہ میں لوگوں کو روحانیت سے وابستہ رکھنے کی کوشش فرمائی۔

ابتدا میں اس علم تصوف کی بنا بھی قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات پر ہی قائم رہی، مگر بعد میں علم کلام، منطق اور فلسفہ کی موشگافیوں نے اسے معرفتِ الٰہی کے صحیح راستہ سے ہٹا کر قرآن و حدیث کی تعلیمات سے دُور کر دیا اور دنیا پرست صوفیوں نے جاہل عوام میں عجیب و غریب طریقے رائج کر دیئے اور انہیں شریعتِ الٰہی کی پابندی سے بھی آزاد کر دیا۔

مختلف بزرگوں کی نسبت سے صوفیا و مشائخ کے کئی سلسلے قائم ہو گئے تھے جن میں سلسلۂ قادریہ حضرت شیخ السید عبد القادر جیلانی کی طرف منسوب ہے جو ۴۷۰ھ میں گیلان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ اپنے دور کے بہت بڑے عابد اور زاہد عالم تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پابند تھے، انہوں نے عراق کے بڑے بڑے شہروں میں قرآنِ پاک کے درس کے سلسلے قائم کئے غنیتہ الطالبین اور فتوح القلوب دو کتابیں لکھیں اور آپ نے ۹۰ سال کی عمر میں ۵۶۱ھ میں انتقال فرمایا۔

سلسلہ قادریہ کے علاوہ دوسرے کئی بزرگوں کے سلسلے چشتیہ، سہروردیہ اور

مودودیہ وغیرہ چلتے رہے اور ان بزرگوں نے تبلیغ اسلام کی بیش بہا خدمات سر انجام دیں، باوجود اس کے کہ والیانِ سلطنت تبلیغ اسلام سے غافل ہو گئے تھے۔

شیخ محی الدینؒ ابن عربیؒ۔ امام ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ جیسے بزرگوں نے تصوف میں غلط طور پر در آمد کئے جانے والے افکار واشغال کی چھان پھٹک کا کام کیا اور اسی تصوف کو پھر سے قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق سنبھالنے کی کوشش کی۔

سیّد ابوالحسن علی ہجویریؒ عرف داتا گنج بخش

کے اِصلاحی کارنامے

سیّد ابوالحسن علی ہجویریؒ نے بھی پانچویں صدی ہجری میں افغانستان کے علاوہ کئی اسلامی ملکوں میں علم ومعرفت کا نور پھیلایا۔ اسی دور میں دنیا کے معروف بت شکن غزنوی نے ہندوستان میں ایک بڑے بت خانہ کو تہ وبالا کر کے ایک عظیم کارنامہ بھی سر انجام دیا تھا۔ حضرت سیّد علی ہجویری نے بھی اس علم تصوف کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اس کی اصلاح کی کوشش فرمائی۔

آپ اپنے زمانہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ خدائے بزرگ وبرتر نے ہمیں اس زمانہ میں پیدا فرمایا ہے جب لوگوں نے حرص وطمع کا نام شریعت، تکبر وجاہ اور ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم، ریاکاری کا نام خوف الٰہی اور دل میں کینہ ودشمنی پوشیدہ رکھنے کا نام حلم۔ لڑائی جھگڑے کا نام بحث ومباحثہ، ہذیان طبع کا نام معرفت الٰہی، دل کی ضربوں اور نفسیاتی باتوں کا نام محبت الٰہی، خدا کے راستہ سے

منحرف اور بے دین ہو جانے کو فقر، حق تعالیٰ اور آخرت پہ ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ اور ترکِ شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔

حضرت موصوف کی بہت سی تصانیف ہیں، ان کی کتاب "کشف المحجوب" ایک مشہور و معروف کتاب ہے جس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور اس کا مطالعہ حقیقتِ تصوّف معلوم کرنے کے لیے بہت بہتر ہے، اس کتاب میں بھی "اطمینانِ قلب" حاصل کرنے کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

شریعت و طریقت میں توازن

حضرت علی ہجویریؒ نے قرآن پاک اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں علم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ علم کے ذریعے ایک سالک مراتب اور درجات کے حصول کے قابل ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو۔ آپ نے ظاہر، باطن اور حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

ظاہر بغیر اصلاح باطن منافقت ہے۔

باطن بغیر ظاہری اصلاح زندقہ و بے دینی ہے۔

علمِ باطن حقیقت اور علمِ ظاہر شریعت ہے۔

آپ نے صوفیائے کرام کے اقوال اور دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ جس شخص کو خدا کی معرفت کا علم یعنی علمِ حقیقت نہیں ہے اس کا دل جہالت اور غفلت کے سبب سے مُردہ ہے اور جس شخص کو خدا کے کلام (قرآن) کا علم یعنی علمِ شریعت نہیں ہے۔ اس کا دل نادانی اور خواہش پرستی کی بیماری میں مبتلا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک دونوں علم لازم و ملزوم ہیں۔

پھر آپؒ شیخ المشائخ یحییٰ بن معاذ الرازیؒ کے اقوال نقل کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ کیا خوب اقوال ہیں :-

تین قسم کے لوگوں سے پرہیز کرو اور بچو!

غافل علماء سے

اُن غافل علماء سے جو دنیا کو اپنے دل کا قبلہ بنا لیتے ہیں، بادشاہوں اور ظالموں کے قریب رہتے ہیں، لوگوں کی دولت اور امارت کو اپنی سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں، اپنے کلام کی باریکیوں پر فریفتہ ہوتے ہیں اور علمائے حق اور بزرگانِ دین سے برہم رہتے ہیں اور لاف زنی میں مشغول رہتے ہیں۔

خوشامدی قاریوں سے

جن کی ہوس اور خواہش کے مطابق اگر کام ہو جائے تو وہ اس کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں اور اگر ان کی پذیرائی نہ ہو تو مخالف کی مذمت شروع کر دیتے ہیں، اپنی کارگذاری کا نقد صلہ مل جانے پر بُرے کاموں پر بھی لوگوں کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔

جاہل صوفیوں سے

جو دین کے راستہ میں سختیاں برداشت کئے بغیر اور کسی عالم و بزرگ سے علم و معرفتِ رب حاصل کئے بغیر لوگوں کے درمیان اُچھل پڑے ہوں اور محض سبز یا گیروا کپڑے پہن کر صوفی بن گئے ہوں۔

اسی طرح خود حضرت علی ہجویریؒ نے صوفی کی اصلیت کے متعلق بڑی محققانہ بحث کی ہے۔ آپ کے نزدیک صوفی کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے

اخلاق و معاملات کو سنوار لیتا ہے اور اپنی طبیعت کو غیر ضروری خواہشات نفسانی سے پاک کر لیتا ہے اور اس بحث میں آپ نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی ان باتوں کی تائید فرمائی ہے کہ:

تصوف کی حقیقی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے جن سے آٹھ برگزیدہ پیغمبروں کی پیروی ہو جاتی ہے۔

۱۔ "تصوف" میں ایثار و سخاوت یعنی راہِ حق میں مال و اولاد تک الٹا دینے اور قربان کر دینے کی مثال اور کیفیت ایسی ہونی چاہیئے جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار فرمائی تھی۔

۲۔ "تسلیم و رضا" کی کیفیت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جیسی ہونی چاہیئے جنہوں نے اپنی گردن خدا کے راستہ میں ذبح ہونے کے لئے پیش کر دی تھی۔

۳۔ "صبر و ثبات" حضرت ایوب علیہ السلام کا اختیار کیا جائے جنہوں نے غربت اور بیماری کا طویل زمانہ نہایت صبر سے گذار دیا تھا۔

۴۔ "اشارات" حضرت ذکریا علیہ السلام کے ہوں۔

۵۔ "غربت" حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سی ہو۔

۶۔ "سیاحت" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سی ہو

۷۔ اور "فقر و فاقہ مستی" حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سی ہو جن کے چولھے مہینوں ٹھنڈے رہتے تھے اور پیٹ پر دو دو پتھر بندھے رہتے تھے۔

یہ تصوف کے مختلف سلسلے بھی چونکہ ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں اس لئے ان کی ایک جھلک ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ تاکہ تصوف سے متاثر لوگوں کے سامنے اس کی صحیح تصویر رکھ دی جائے اور وہ ذہنی الجھنوں سے پاک

ہو کر اطمینان قلب کے صحیح راستہ کو اختیار کر سکیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تصوّف

تصوّف کے بعض بزرگوں نے اپنے سلسلہ کا تعلق خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اس لئے حضرت علی رضؓ کی زندگی اور آپ کے ارشادات پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ شیخ عطارؒ رومیؒ اور دوسرے تذکرہ نویس، سلسلۂ تصوف کا باقاعدہ آغاز حضرت حسن بصریؒ سے کرتے ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کو فیضانِ علم حضرت علیؓ سے حاصل ہوا تھا، پھر بعض لوگ اس قسم کے خیالات بھی رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ان ظاہری علوم کے علاوہ کچھ خاص باتیں اور بھی بتائی تھیں جس کی تردید خود حضرت علیؓ فرما گئے ہیں۔

آپ کے شاگردوں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ کیا قرآن کے سوا کچھ اور بھی آپ کے پاس ہے؟

آپؓ نے اُن کے جواب میں فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جو ایک دانے کو پھاڑ کر درخت اگا دیتی ہے اور جو انسانی جان کو انسانی جسم کے اندر سے پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کے سوا میرے پاس کچھ اور نہیں ہے لیکن قرآن کی فہم وفراست خدا جس کو چاہے دے دے۔ اس کے علاوہ چند حدیثیں میرے پاس ہیں۔

سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ نے بچپن سے لے کر حضورؐ کے وصال تک کامل تیس سال آپؐ کی خدمت اور رفاقت میں گذارے پھر حضور کے بعد بھی تقریباً تیس برس تک مسند ارشاد پر جلوہ فرما رہے خلفائے ؛ کے عہد میں بھی یہ خدمت آپ کے سپرد رہی اور آپ کی نگاہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ مسائل کی تہ تک

بآسانی پہنچ جاتی تھی۔ آپؓ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر مقدمات کے فیصلے اور قضا کے لئے نہایت موزوں تھے۔ اس علم و فضل کے مراتب کے ساتھ ساتھ آپ نے شجاعت اور مردانگی کے بھی بے شمار کارنامے سرانجام دیئے۔ اسلام اور کفر کے پہلے معرکہ، جنگِ بدر میں بھی سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تلوار چمکی اور قتل ہونے والا پہلا کافر انہی کے ہاتھوں قتل ہوا اور اسلام کی باقی تمام جنگوں میں بھی آپ کا کردار نہایت دلیرانہ اور سرفروشانہ رہا۔ غزوہ خیبر میں بھی خیبر کے قلعہ کا نہایت مضبوط دروازہ آپ کی ضربِ کاری سے ٹوٹا۔

آپ کی حکمت و دانش

زندگی کی حقیقتوں کے متعلق آپ کے حکیمانہ اقوال کا ایک انمول خزانہ موجود ہے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر جو خطبات ارشاد فرمائے یا خطوط تحریر فرمائے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

دُنیا کی حقیقت

دنیا کی حقیقت کے متعلق آپؓ فرماتے ہیں۔

اے لوگو! سوچو! تم سے پہلے بھی یہاں کوئی آباد تھا۔ اُن کی خواہش دراز اور وسائل بے پایاں تھے، اُن کے بڑے لشکر تھے۔ اور ان کو دنیا سے پیار تھا۔ لیکن آخر ان کو یہاں سے جانا پڑا اور اس دنیا کی کسی چیز نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ کسی نے ان کی مدد یا دستگیری نہیں کی۔ تنگ کوٹھڑی کے سوا اُنہیں کوئی منزل نہ ملی اور دنیا کے چراغوں میں سے کوئی اُن کی تاریک رات روشن نہ کر سکا۔

خدا کا خوف

خدا کے خوف کے متعلق آپ نے فرمایا۔

اے بندگانِ خدا! ڈرو اُس قادرِ مطلق سے، جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اس کے ڈر سے اَجرِ آخرت کا سودا کر لو اور اس طرح ڈرو کہ آخرت کے اجر کے مستحق بن جاؤ۔

خدا نے تمہیں کان دیئے کہ تم (حق بات) سُن سکو۔

تمہیں آنکھیں عطا کیں کہ تم حقائق کو دیکھ سکو۔

خدا نے تمہیں تمہارے بدن کے اعضا کو مناسب ترین جگہوں پر رکھ دیا تمہاری زندگی اور عمر کا عرصہ مقرر کر دیا لیکن تم سے پوشیدہ رکھا اور آگے جانے والوں کے آثار کو تمہاری عبرت کے واسطے باقی رکھا۔

تم غور کرو ان باتوں پر

اطاعتِ خداوندی اور نماز

فرمایا اے لوگو! اپنے تمام معاملات میں احکامِ خداوندی کی پیروی کرو۔ اپنے نفس کو ترغیب دے کر عبادت میں لگاؤ۔

عبادت کے بارے میں اسے مجبور کرو

جب ذہن فارغ ہو تو اسے عبادت یعنی ذکرِ الٰہی کی طرف مائل کرو

لیکن فرض نمازوں کا مسئلہ اس سے جُدا ہے۔

یہ نمازیں تو ہر حال میں اپنے وقت پر ادا کرنی ہیں۔

رُوحانیت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ

روحانیت کی بحث میں ہم روحانیت کے اسلامی تصور اور روحانیت کے حقیقی مفہوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تصوف کی بھی وضاحت پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ روحانیت حاصل کرنے کے بڑے ذرائع کون کون سے ہیں اور ان کے ذریعہ اطمینانِ قلب کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ، مشائخ اور بزرگانِ دین کے اقوال اور ارشادات سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ انہوں نے انسانیت کے اصل جوہر "روحانیت" کو کس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے حصول کے لئے کیسے حکیمانہ اور متوازن طریقے بتائے ہیں تاکہ انسان اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں اس کے روحانی پہلو کو بھی پیش نظر رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی نہایت واشگاف الفاظ میں اپنے کلامِ پاک میں تمام انسانوں کو متنبہ فرمایا کہ "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ

خبردار

اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے

(پارہ ۱۳ سورہ الرعد)

قرآن پاک کی اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں بلند پایہ مفسرین نے ذکر اللہ

سے مراد "کتاب اللہ" اور "کلام اللہ" لیا ہے، علامہ حافظ ابن قیمؒ نے ایک
مشہور صوفیؒ کی کتاب "منازل الصالحین" کی ایک شرح "مدارج السالکین"
کے نام سے لکھی ہے جس میں آیت کی تشریح میں ذکر اللہ سے مراد قرآن پاک
ہی لکھا گیا ہے کہ "قرآن پاک" چونکہ اللہ تعالےٰ کا کلام ہے اور ایک مومن کو
چونکہ دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ محبت اللہ تعالےٰ سے ہوتی ہے۔۔۔
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور محبوب کی باتوں اور اس کے کلام
سے عاشقانِ الٰہی کو لذت حاصل ہوتی ہے اور سکون ملتا ہے۔ اسی لئے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خوش الحان صحابہ سے فرمائش کیا کرتے تھے کہ وہ قرآن پاک
کی تلاوت کر کے اُن کے دِل کو خوش کریں۔ چنانچہ صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم قرآن پاک کی تلاوت سے خوب محفوظ ہوا کرتے تھے اور دن اور
رات میں کئی کئی سورتوں کی تلاوت پابندی سے کیا کرتے تھے۔ آپ کی پیروی
میں بعد کے صالحین اور بزرگوں کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں قرآن کی تلاوت اور اس کے احکام سے غفلت برتنے
والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے اور اُن کے دِل
ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔

سورۂ زخرف میں فرمایا کہ جو شخص قرآن نہیں پڑھتا اور اس سے غفلت
برتتا ہے اس پر ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے، جو اس کے ذہن کو طرح
طرح کے خیالات سے پریشان رکھتا ہے۔

---

[1] شیخ الاسلام علامہ عبداللہ بن محمد بن علی الصوفی (کتاب السائرین)

اور یہ قرآن پاک انسان کو ایک تو اس کے محبوب کا کلام (کلام الٰہی) ہونے کی وجہ سے اطمینان بخشتا ہے اور دوسرا اُسے ایک ایسا "نظامِ زندگی" اسلام کی صورت میں عطا کرتا ہے جس کو اختیار کرنے سے انسان کو زندگی کے تمام معاملات میں اور تمام مراحل میں اطمینان و سکون حاصل رہتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کتاب میں انسانی زندگی کے تمام معاملات کے متعلق اجمالاً بحث کی ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی تشنہ نہ رہے اور ان سب معاملات میں قرآن پاک چونکہ ہماری فکری و عملی راہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے قرآنِ پاک کے مفسّرین نے بھی اس آیت کی تفسیر میں ذکر اللہ سے مراد قرآن پاک کو ہی لیا ہے۔

قرآنِ پاک کے ساتھ ساتھ ذکرِ الٰہی کے دوسرے مسنون طریقے بھی چونکہ روحانیت کی ترقی میں بہت ممد ثابت ہوتے ہیں اور انسان کے اطمینانِ قلب کے لئے ایک کامیاب ہتھیار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے اس ذکرِ الٰہی کے متعلق بھی ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

ماڈرن فلاسفی اور ذکرِ الٰہی

آج کا انسان اپنی کم علمی اور حقیقت ناشناسی کی وجہ سے جدید سائنس اور ماڈرن فلاسفی سے کچھ زیادہ مرعوب ہو گیا ہے اور علمِ دین اور رُوحانیت کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا ہے حالانکہ جدید سائنس جوں جوں ترقی کرتی جا رہی ہے اس پر علمِ دین کی اہمیت اور روحانیت کی قدر و قیمت واضح ہوتی جا رہی ہے۔ جدید سائنس نے خطرناک اور لاعلاج بیماریوں کے سلسلہ میں آج جو ریسرچ کی ہے۔ اس میں ذکرِ الٰہی اور مراقبہ (Meditation) کی اہمیت کو تسلیم

کیا جانے لگا ہے۔

برطانیہ کے ہاورڈ میڈیکل سنٹر میں ہائی بلڈ پریشر، دل کی بیماریوں اور سرطان (cancer) تک کے علاج کے سلسلہ میں جو تجربات کئے گئے ہیں اُن سے اس عجیب و غریب حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ ان بیماریوں پر قابو پانے کا بہترین طریقہ مراقبہ اور ذکر ہے۔ مغربی دنیا چونکہ مذہب کی گرفت سے آزاد ہوگئی ہے اس لئے اس میں یہ بیماریاں کثرت سے پھیلنے لگی ہیں۔

ہائی بلڈ پریشر کا واحد سبب شدید الاحساسیت (sensitiveness) اور اثر پذیری (Hypertension) ہوا کرتی ہے۔ جس کے سبب خون کے دباؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تردد اور تشویش کی ذہنی کیفیات کے سبب خون میں ایک کیمیاوی مادہ (Adrenaline) پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب خون کی باریک نالیوں میں خون کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور بلڈ پریشر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسان کے دل کو خون پمپ کرنے میں زیادہ زور لگانا پڑتا ہے اور یہیں سے دل کی بیماریوں کی ابتدا ہوتی ہے اس کے لئے جو دوائیں ایجاد کی جاچکی ہیں وہ کبھی مفید ثابت ہوتی ہیں اور کبھی غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ مراقبہ اور ذکر ان تمام بیماریوں کے ایسے علاج ہیں جو ہر قسم کی تشویش اور دل کی بے چینی کا آہستہ آہستہ مداوا کر دیتے ہیں۔

[1] ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ پُرسکون حالت میں بیٹھ جائیں اور آنکھیں بند کرکے کسی چیز یا تصویر میں اپنی توجہ مرکوز کر دیں یا اگر یہ ممکن نہ

---

[1] ایک مومن کو روزانہ پانچ نمازوں میں ارتکاز توجہ کا یہ موقع پندرہ منٹ سے ایک گھنٹہ

(باقی ص۳۰۷ پر)

ہو تو کسی ایک ہی جملے یا لفظ کو بار بار دہرائیں (اور ظاہر ہے کہ یہ لفظ اللہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جس سے دلوں کو تسکین ملتی ہے) پھر خاص طور پر انہیں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ مراقبہ یا ارتکازِ توجہ کا یہ عمل علی الصبح کہیں خاموش اور پرسکون فضا میں کیا جائے، جن مریضوں کو اس طرح مراقبے یا ذکر (کسی لفظ کو بار بار دہرانا مثلاً اللہ ہُو۔ اللہ ہُو) کی ہدایت کی گئی تھی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اس عمل سے ہائی بلڈ پریشر میں نمایاں کمی ہوتی ہے۔ اس عمل کی مدّت کم از کم ۲۰ منٹ تک تجویز کی گئی ہے ہاورڈ میڈیکل سنٹر کی اس ریسرچ سے علی الصبح تلاوتِ کلام پاک، ذکر و فکر مراقبہ اور عبادت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے جسم اور روح دونوں کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔

اسلامی عبادات کے نظام کا ہی یہ فطری اعجاز ہے کہ انہیں ایک مسلمان کی روزمرّہ زندگی میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ جن سے غیر محسوس طور پر انسان کو بے شمار جسمانی اور رُوحانی فوائد حاصل ہوتے رہتے ہیں۔

صبح و شام کے ذِکر کی افادیت

صبح و شام کے دونوں اوقات میں خاص طور پر اسلام نے ذکر کی جو تاکید کی ہے اس کی افادیت کو بھی جدید سائنس دان اب تسلیم کرنے لگے

(بقیہ از صفحہ ۳۰۶) یک بتیسر آجاتا ہے جب کہ نماز کی حالت میں اس کی نگاہیں سجدہ کی جگہ پر گڑی ہوتی ہیں اور اس کے ذہن میں صرف یہ تصور قائم رہتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے یا خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔ عبادات کو ان کی شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرنے سے ایک مومن کی بہت سی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کا مداوا ہوتا رہتا ہے۔

ہیں۔" وَسَبِّحْ بِحَمْدِكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ

اللہ کے نام کی تسبیح کرو صبح اور شام (ارشادِ ربانی)

حدیثِ قدسی :۔ "اے میرے بندے! تو صبح کی نماز کے بعد اور عصر کے بعد تھوڑی دیر کے لئے مجھے یاد کرلے، تو میں ان دونو اوقات کے درمیانی عرصہ میں تیری بہت سی ضروریات کا کفیل اور ذمہ دار ہو جاؤں گا۔"

(مسند احمد از فضائل)

حضورؐ نے فرمایا کہ: "جو شخص صبح کی نماز با جماعت ادا کرنے اور پھر وہیں بیٹھ کر اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے۔ یہاں تک کہ سورج نکل کر کچھ بلند ہو جائے۔ پھر دو رکعت نماز نفل پڑھ لے۔ تو اس کو حج اور عمرہ تک کا ثواب مل جاتا ہے۔" (ترمذی و مشکوٰۃ شریف)

اب سائنس دان کہنے لگے ہیں کہ یہ صبح کی نماز کے بعد طلوعِ شمس تک مسلمانوں کو جو مسجد میں ٹھہر کر اللہ کے ذکر کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سے طلوعِ شمس کی ابتدائی کرنیں اور رنگارنگ شعائیں، یکسوئی کی حالت میں انسان کے سانس کے ساتھ اس کے بدن میں پہنچتی ہیں تو اس کے جسم پر نہایت صحت مندانہ کیمیاوی اثرات مرتب کرتی ہیں اور اس کا بدن کئی بیماریوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ذکرِ الٰہی کی آسانی

ذکرِ الٰہی کی انہی احادیث کے پیشِ نظر اس کو اکثرت سے کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور اس کو آسان بھی بنا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ؕ

"اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو"

ذکرِ الٰہی سے چونکہ انسان کا دل و دماغ تفکرات اور پریشانیوں سے پاک رہتا ہے اور دل و دماغ اطمینان سے سرشار ہوتے ہیں اس لئے ذکرِ الٰہی ہی وہ واحد عبادت ہے جس کو کثرت سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پھر اس کو آسان بھی بنا دیا گیا تاکہ وہ ہر لمحہ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہ سکے۔

ذکرِ الٰہی کے علاوہ دوسری جتنی عبادات ہیں ان کے لئے کوئی نہ کوئی وقت مقرر ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر ان کی ادائیگی کے بعد انسان فارغ ہو جاتا ہے لیکن ذکرِ الٰہی ہر وقت جاری رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ اس نے ہماری کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس اہم ترین اور مفید ترین عبادت کے لئے کوئی شرط یا پابندی عائد نہیں کی ہے۔ اس کے لئے نہ وضو کی شرط رکھی نہ غسل کی پابندی لگائی، نہ کوئی وقت معین کیا، نہ اس کے لئے قبلہ رُو ہونے کی شرط عائد کی، بلکہ واضح طور پر فرما دیا کہ ذکرِ الٰہی۔ ہر حال میں، ہر وقت۔ بیٹھے، لیٹے، کھڑے ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ ہاں انسان بطورِ خود اس کے لئے پاکیزگی و طہارت کی حالت کا خیال رکھے تو یہ زیادہ بہتر ہے البتہ رفعِ حاجت کے وقت، یا وظیفۂ زوجیت میں مصروفیت کی حالت میں خاموش رہنا ہی عبادت ہے۔

اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زبان پر ہر وقت اور زندگی کے ہر معاملہ میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے اور خدا کا خیال اس کے دل و دماغ میں رچا بسا رہے اور ذکرِ الٰہی اس کے شعور سے گذر کر اُس

کے تحت الشعور بلکہ لاشعور تک میں گہرا اتر گیا ہو۔ جو کام بھی کرے خدا کا نام لے کر کرے۔ ہر نعمت پر خدا کا شکر ادا کرے، ہر مشکل وقت اور مصیبت پر صبر کرے اور اس کی رحمت کا طلب گار رہے، ہر حاجت یا ضرورت پیش آنے پر اسی سے دعا مانگے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

ذکر کے معنی

ذکر کے لفظی معنی یاد کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا نام "ذکرِ الٰہی" ہے اور اس یاد کا تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہوتا ہے اور دل کے بعد یہ یاد زبان پر آجاتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ذکر کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ذکر کا لفظ قرآن پاک میں بھی "یادِ الٰہی" اور "ذکر اللہ" کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ (ذکر) کا لفظ یاد دہانی اور نصیحت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ذکر کا لفظ یادِ الٰہی اور ذکر اللہ کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔

ذکرِ الٰہی کا مفہوم و مطلب

ذکرِ الٰہی اور یادِ الٰہی کا مطلب قرآنِ پاک کی اصطلاح میں یہ ہے کہ:۔

" انسان اللہ تعالےٰ کی ذات اور اس کی صفات کے تقاضوں کو ذہن میں حاضر رکھتے ہوئے، اس کی نعمتوں اور احسانات کو یاد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی پاکی، حمد اور بڑائی بیان کرے اور دل میں یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے، زمین و آسمان کی سب چیزیں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اس کی ذات سب پر غالب ہے۔"

ذکر کے ساتھ فکر بھی لازمی ہے اس لئے ذکر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حضورِ قلب کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اس کی ذات میں تفکر بھی کرے اور اس کا ذکر بھی کرے یعنی ذکر کے ساتھ غور و فکر بھی ہو۔ ذکر بِلا فکر نہ ہو۔

ذِکر کے اقسام

حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہیئے کہ تین مواقع پر اپنے قلب کا جائزہ لیتا رہے۔

۱۔ قرآن کو سُننے اور پڑھتے وقت
۲۔ ذکر کرتے وقت اور ذکر کی مجلسوں میں
۳۔ تنہائی اور خاموشی کی حالت میں۔

اگر ان تین مواقع پر اپنے پہلو میں دل کو حاضر نہ پاؤ، تو اللہ تعالیٰ سے دُعاء درخواست کرو کہ وہ تمہیں دِل مرحمت فرمادے۔ اس لئے کہ تمہارا دل تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

ذکر کی حالت میں جب انسان کی زبان ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو اور اس کا دل و دماغ بھی اس کا ساتھ دے رہا ہو تو یہ ذکر کی اعلیٰ قسم ہے۔

۱۔ چنانچہ زبان سے "الحمدللہ" کہنا زبان کا ذکر ہے۔
۲۔ "الحمدللہ" کا مطلب سمجھنا یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام کمالات کا اقرار کرتے ہوئے اس کی تعریف کرنا دماغ کا ذکر ہے
۳۔ "الحمدللہ" کہتے ہوئے دل کا اس کی نعمتوں کے شکریہ سے سرشار ہو

جانا دل کا شکر ہے۔

۴۔ الحمد للہ کے مطابق عمل کرنا بدن کا شکر ہے اور اس کی نعمتوں اور احسانات کے شکریہ کے طور پر اس کی اطاعت کرنا۔ بدن کا ذکر ہوگا۔

۵۔ خدا کے دیئے ہوئے مال کو خوشی خوشی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔ یہ مال کا شکر اور ذکر ہوگا۔

۶۔ ذکرِ خفی یعنی چپکے چپکے اللہ کا ذکر کرنا بھی ذکر کی بہترین قسم ہے۔ یہ اللہ کا ذکر چاہے دل میں کرے یا زبان سے۔ نہایت آہستگی سے کرے جس کا حال مخلوق سے پوشیدہ رہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ذکر خفی کا اجر بھی فرشتوں سے بالا بالا انسان کو براہِ راست عطا فرما دیتے ہیں۔ ذکرِ خفی کی یہ کیفیت ذکرِ جہری سے ستر درجہ افضل ہے۔

ذکر کے فوائد

ذکرِ الٰہی:۔ دل کو زندہ کرتا ہے

دِل کے زنگ کو صاف کرتا ہے

دِل سے فکر و غم اور خوف و ہراس کو دُور کرتا ہے۔

دل میں فرحت اور سرور پیدا کرتا ہے

دل میں اطمینان و سکون پیدا کرتا ہے

ذکرِ الٰہی:۔ اللہ سے محبت پیدا کرتا ہے

اللہ کا قرب پیدا کرتا ہے

اللہ سے دوستی پیدا کرتا ہے

اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بنتا ہے

اللہ کی طرف رجوع اور معرفت کا ذریعہ بنتا ہے۔

ذکرِ الٰہی:- خدا کی ہیبت اور خوف پیدا کر کے گناہوں سے بچاتا ہے۔

تکبّر کو دور کر کے تواضع و انکساری پیدا کرتا ہے۔

مایوسی اور شکستہ دلی کو دور کر کے خدا کی رحمت کی امید پیدا کرتا ہے

دنیا پرستی اور مادہ پرستی کو دور کر کے خدا پرستی اور آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے۔

آدابِ ذکر

اگرچہ حق تعالیٰ نے ذکر کے لئے کوئی خاص شرط نہیں رکھی ہے اور اس کو آسان کر دیا ہے تاکہ انسان ہر قسم کے حالات میں اپنے اللہ کو مدد کے لئے پکار سکے اور اس کو یاد کر سکے لیکن اگر ذکر کے لئے خاص اوقات و شرائط اور اس کے آداب کا لحاظ رکھا جائے تو یہ ذکر کو زیادہ مؤثر بنا دیتے ہیں۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کو ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کے ذکر کی تلقین فرمائی تھی اور جس کی تابعداری میں آج بیشتر نمازی ہر نماز کے بعد اس ذکر کی پابندی کرتے ہیں۔

۱۰ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو زندگی کے مختلف اوقات و حالات، سفر و حضر، میں جن اوراد و وظائف اور دعاؤں کی تلقین کی ہے ان کی پابندی کی جائے۔

۲- ذکر دل کی کامل یکسوئی اور توجہ سے کیا جائے۔

۳- دن یا رات کے خاص اوقات میں اگر انسان نے بطور خود، تلاوتِ کلام پاک، ذکر و تسبیح، درود شریف اور استغفار یا نفل پڑھنے کا معمول بنالیا ہو تو اس کی پابندی کا اہتمام کرے کیوں کہ نیک کاموں میں مداومت اور پابندی کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور اس استقامت کا درجہ کرامت سے بھی بڑھ کر ہے " اَلْاِسْتِقَامَتُ فَوْقَ الْکَرَامَت "

حضرت عمرؓ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص نے اگر پچھلی رات کے وقت کا کوئی وظیفہ یا نفلی نماز کا معمول بنا رکھا ہو اور کسی روز نیند کے غلبہ کی وجہ سے ادا نہ ہو سکے تو اُسے نمازِ فجر کے بعد نمازِ ظہر کی درمیانی وقت تک ادا کرلے تو ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے رات کے مقررہ وقت میں اُس نے ادا کیا ہو۔

۴- رات کے آخری حصّہ کا ذکر۔ رات کے آخری حصّہ میں انسان بیدار ہو کر اگر عبادت یا ذکر کرے تو یہ بھی بہت بڑی سعادت ہے، اسی کے متعلق علامہ اقبال فرما گئے ہیں :-

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

آخرِ شب کا وقت عبادت، دُعا اور ذکر کے لئے بے نظیر اور اکسیر ہے۔ انبیاؑ اور صالحین اس سنہری وقت میں عبادت، ذکر اور دُعاؤں کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ اس وقت نمازِ تہجّد کے طور پر آٹھ رکعت نفل پڑھ لئے جائیں تو یہ مسنون طریقہ ہے۔

۵- آخرِ شب کے اس سنہری وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری

ہے کہ انسان عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد غیر ضروری مشاغل سے پرہیز کرے اور جلدی سو جائے تاکہ رات کے آخری حصہ میں جاگ کر عبادت کر سکے۔

حضرت فاروق اعظمؓ لوگوں کو عشاء کی نماز کے بعد جلدی سو جانے کی اور صبح سحری کے وقت جاگنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

۶۔ تنہائی کے ذکر کی بھی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ

سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب کہ کوئی سایہ نہ ہوگا اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دیں گے ان میں سے ایک شخص وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا تنہائی میں ذکر کیا کرتا تھا اور خدا کے خوف وخشیت کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

۷۔ ذکرِ الٰہی کو زیادہ مفید اور مؤثر بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

انسان

اپنے معاملات کی صفائی کا خیال رکھے

اچھے اخلاق وعادات کو اختیار کرے

اپنے وعدے اور امانتوں کی پاسداری کرے

گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرے

جھوٹ نہ بولے۔ غیبت۔ حسد کینہ اور بغض سے بچے۔

ذکر کی افضل ترین صورتیں

کلمۂ توحید یا کلمۂ طیّبہ

ذکرِ الٰہی کے کلمات میں سے تمام کلمات میں افضل ترین کلمۂ توحید یا کلمۂ طیبہ ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اس لئے اسے افضل الذکر کہا جاتا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام کلمات میں سے افضل ترین کلمۂ ذکر

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ہے اور تمام دعاؤں میں سے افضل ترین دعا الحمد للہ ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تمام اذکار میں سے افضل اور بلند مرتبہ ذکر "کلمۂ طیّبہ" ہے کہ یہی دین کی وہ بنیاد ہے جس پر سارے دین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہی کلمۂ اقدس "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" وہ دروازہ ہے جس کے ذریعہ انسان دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں اس کلمہ کو "کلمۂ توحید، کلمۂ تقویٰ عُروۃ الوثقیٰ (مضبوط رسی) دعوۃ الحق سرمایۂ حیات، اور کلمۂ اخلاص لکھا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

• فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (سورہ الفتح رکوع ۳)

"پس اللہ تعالیٰ نے اپنی سکینت (اطمینانِ قلب و سکون) اپنے رسُولؐ پر اور ایمان والوں پر نازل فرمائی اور ان کو تقوے کے کلمہ پر جمائے رکھا اور وہی اس تقوے کے کلمہ کے مستحق اور اہل تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے اسلام اور کفر کا دار و مدار بھی اسی کلمہ پر رکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوّل سے آخر تک اسی کلمہ کی طرف دعوت دیتے رہے اور اسی کلمۂ توحید کی پاداش میں آپؐ کو اتنا ستایا گیا کہ آپؐ نے خود ایک حدیثِ پاک میں یہ فرمایا۔

"کہ دنیا میں کسی انسان کو اتنی اذیتیں نہیں دی گئیں اور اتنا نہیں ستایا گیا ہے کہ جتنا مجھے ستایا گیا ہے۔"

کفار و مشرکین آپ کی مخالفت اسی لئے تو کرتے تھے کہ آپ اس کلمۂ توحید کی دعوت دیتے تھے اور اس کلمہ کے اُس مفہوم اور معانی کی طرف بلاتے تھے جس کی تشریح ہم اس کتاب کے دیباچہ اور ایمان باللہ کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اللہ ہو۔ اللہ ہُو کہنے کا یہی مطلب ہوتا ہے اس کلمہ کا مفہوم ہر مسلمان کے ذہن میں ہر وقت تازہ رہنا چاہیئے۔

کلمۂ طیبہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے تمام صفاتی نام اس قابل ہیں کہ اُن کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جائے۔ پس انسان کو جب بھی کوئی حاجت پیش آئے تو اپنی اُس حاجت سے مناسبت والے صفاتی نام سے اللہ کو پکارے مثلاً "یا رحمٰن۔ یا رحیم۔ یا غفور۔ یا ستار۔ یا رزاق۔ یا وہاب وغیرہ۔ ان کے علاوہ درود شریف اور استغفار پڑھتا رہے۔ ہر فرض نماز کے

بعد ایک تسبیح سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کی پڑھے جس کی تاکید حضورؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی کو فرمائی تھی۔

نماز

عبادات میں ذکرِ الٰہی کی افضل ترین صورت "نماز" ہے۔ نماز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَقِیْمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ

نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے

نماز کو قائم کرنا، ذکر کی افضل ترین صورت اس طرح ہے کہ نماز کی تیاری کے لئے انسان سب سے پہلے خدا کے دربار میں حاضری کے لئے اپنے جسم اور کپڑوں کی پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے۔ پھر نماز پڑھنے کے لئے پاک جگہ کی تلاش کرتا ہے۔ خدا کے گھر خانہ کعبہ کی سمت معلوم کرتا ہے۔ اچھی طرح ہاتھ، منہ اور پاؤں دھوکر وضو کرتا ہے۔ تکبیر اولیٰ کہہ کر دنیا کے تمام مشاغل سے دست بردار ہوکر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کے جسم کے تمام اعضاء خدا کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ کبھی دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ رکوع کے لئے خدا کے سامنے جھک جاتا ہے، سجدے کی حالت میں اپنی پیشانی کے بل سر کو بھی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے۔ اور اس طرح انسان کو اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہو جاتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نماز واقعی اللہ کے ذکر کی افضل ترین صورت ہے، جو کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اول نمبر پر فرض نمازیں ہیں

اور دوسرے نمبر پر نفلی نمازیں۔ اشراق، چاشت، اوابین اور صلوٰۃ التسبیح وغیرہ ہیں جن کی ترغیب دی گئی ہے۔

تلاوتِ کلامِ پاک

قرآن پاک کی تلاوت بھی ذکر الٰہی کی اعلیٰ صورت ہے۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعے دنیا کے لوگوں کو آپؐ راہِ ہدایت کی طرف بلائیں۔ اللہ تعالٰے کا یہ کلام چونکہ ہماری ہی راہنمائی کے لیئے نازل ہوا ہے اس لیئے ہم پر لازم ہے کہ ہم اس کی تلاوت بھی کریں۔ اس کے معنی کو بھی سمجھیں۔ اس کے احکام کو معلوم کریں۔ قرآنِ پاک چونکہ عربی میں ہے اور ہماری مادری زبانیں مختلف ہیں اس لیئے ہمیں قرآنِ پاک کے معنی اور مطلب اپنی زبان میں سمجھنے کی ضرور کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ذکرِ الٰہی کا یہ بہت بڑا ذریعہ ہے

ایک معتدل اور متوازن نظامِ زندگی

انسان کے جسم، نفس اور رُوح کی ضروریات کے ضمن میں پچھلے ابواب میں جو بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر آپکے سامنے آگئی ہو گی کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لیئے جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے۔ اس میں انسان کے تینوں عناصر کی ضروریات کا بڑی خوبی کے ساتھ لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے انسان کو اس بات کا خدشہ نہیں رہتا کہ جب وہ اپنے جسم کی مادی ضروریات

پوری کر رہا ہو گا تو اس پر مادیت غالب آجائے گی اور جب اپنے نفس کی خواہشات یا جذبات کی تکمیل میں لگ رہا ہو گا تو اس کی روح کے تقاضے نظر انداز ہو رہے ہوں گے اور وہ خواہش پرست یا شہوت پرست بن کر اپنے جسم یا روح کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جائے گا اور جب روحانیت کی طرف مائل ہو گا تو اپنے بدن اور نفس کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دے گا۔

اسلام نے انسان کو حکمت پر مبنی ایسی ہدایات دے دی ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کو ایک ایسا صراطِ مستقیم مل جاتا ہے جو اسے انسانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے جذبات و خواہشات اور شہوات کو ایسی میانہ روی نصیب ہو جاتی ہے جس سے اس کا جسم اور روح بھی اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسلام نے روحانیت کی ترقی اور پرورش کے لئے عبادات کا جو نظام تجویز کیا ہے اس سے اس کے جسم اور نفس کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں اور کائنات کی تمام مخلوق میں اس کا وقار اور مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اس طرح اس کے جسم، نفس اور روح تینوں کو اطمینان کی دولت بھی میسر آجاتی ہے۔

جدید ماہرین نفسیات اور دینِ اسلام

آج دنیا بھر کے ماہرین نفسیات اپنی تحقیقات اور غور و فکر کے نتیجے میں اس بات پر متفق ہیں کہ تمام دماغی بیماریوں کی ابتدا (Frustration) یعنی بے اطمینانی اور ذہنی الجھنوں سے ہوتی ہے۔ پہلے صرف دورانِ سر، ہارٹ اٹیک اور معدہ کے السر (Ulcer) کو نفسیاتی عوامل کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا مگر اب معدہ

جگر، دل اور جلد کے کئی امراض کے علاوہ سرطان (Cancer) جیسے موذی مرض کے اسباب میں بھی "ذہن" کا دخل تصور کیا جاتا ہے۔

وہ ہارمونز یعنی غدودی رطوبتیں جو سرطان کی افزائش کا سبب بنتی ہیں۔ انسان کی نفسیاتی الجھنوں سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً (Supra renal Glands)

(GLANDS

انسان کے ذہن پر جب کسی پریشان کن الجھن کا دباؤ پڑتا ہے اور ذہن مختلف اور متضاد صورتحال سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک شدید جذباتی ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے جسم کی غدود کا نظام (Glands) متاثر ہوجاتا ہے۔

جیسے خوف کی حالت میں انسان کا چہرہ زرد پڑجاتا ہے۔ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں وہ پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے۔

غصّہ کی حالت میں اس کا چہرہ سُرخ ہوجاتا ہے اور اس کی رگیں پھُول جاتی ہیں۔

ہیجان میں سانس غیر متوازن ہوجاتا ہے، رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔

احساسِ کمتری کی حالت میں، انسان اپنی گفتگو میں اٹکنے اور ہکلانے لگتا ہے۔

عجز وانکساری میں چہرہ کی خاص حالت ہوجاتی ہے۔

خوشی کے موقع پر انسان کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

یہ سب اثرات غدودی نظام اور نفسیاتی عمل کے اشتراک کے واضح مظاہرے

ہوتے ہیں۔ ان حقائق سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح انسان کا جسم ذہنی احساسات اور جذباتی عوامل سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ خوف، غصہ، غم، تشویش، اضطراب، بے چینی، تعصب، حسد، انتقام وغیرہ قسم کے تمام منفی اور تخریبی جذبات، نفس اور جسم دونوں کو زہر آلود کرتے رہتے ہیں۔

ان معاملات میں جدید ماہرینِ نفسیات نے فلسفہ اور منطق سے کام لیتے ہوئے مصنوعی استدلالی طریقوں سے انسان کی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ انسان کی بے چینی اور پریشانی دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے

اس میدان میں بھی دینِ اسلام کا ہی یہ اعجاز ہے کہ اس نے ان تمام منفی جذبات اور تخریبی رجحانات کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور پوری شدت سے ان کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ ان کی اصلاح کے لئے انسان کے اندازِ فکر کو بدلا ہے اور اس کی سوچ اور عمل کے معیار اور قدروں کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے اور ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر ذکرِ الٰہی کی مختلف صورتوں کو اپنانے کی ترغیب دی ہے۔

اللہ تعالیٰ جو تمام علوم اور سائنس کے سرچشمہ ہیں اور انسان کے خالق ہیں تمام لوگوں کو نہایت کھلے الفاظ میں یہ وارننگ دی ہے کہ۔

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

"خبردار! اللہ کے ذکر میں ہی اطمینانِ قلب ہے" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرما دیا کہ حقیقی روحانی سکون اور اطمینان، کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں ہے جس سے انسان کو صحیح معرفتِ نفس اور معرفتِ رب حاصل ہو جاتی ہے۔

اطمینانِ قلب کا یہ نسخہ بتا کر اللہ تعالیٰ نے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

لوگوں کو۔ کاہنوں، نجومیوں، جوتشیوں، عاملوں اور خدا سے غافل ماہرین نفسیات (PSYCHOLOGISTS) کے پاس جانے سے روک دیا ہے اور ان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ جو جہالت کی بنا پر لوگوں کو اپنے دام میں پھانستے رہتے ہیں۔

اطمینانِ قلب حاصل کرنے کی چند ضروری شرائط

اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے پچھلے ابواب میں ہم جن امور پر بحث کر چکے ہیں اُن پر نگاہ ڈالنے سے چند ضروری شرائط سامنے آتی ہیں جن پر عمل کرنے سے ہمیں اطمینانِ قلب کا صحیح راستہ مِل سکتا ہے۔

شرطِ اوّل —— کلمۂ پاک کا مفہوم

کلمۂ پاک کے مفہوم کو نئے سرے سے اپنے ذہن میں تازہ کرے۔ جس کا اقرار کر کے اور جس پر ایمان لا کر وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا ہے۔ کیوں کہ یہی کلمۂ پاک انسان کو اس کائنات کے اصل حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ انسان کو اس کی زندگی کا صحیح نصب العین عطا کرتا ہے۔ اُسے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ کلمہ ہی دراصل اطمینانِ قلب کا دروازہ اور جنّت کی کنجی ہے جو انسان کے دل کو وسعت اور کشادگی دے دیتا ہے۔ کلمۂ پاک کا یہ مفہوم اس کتاب کے دیباچہ میں درج کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے مطالعہ کر کے اسے ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔

کلمۂ پاک کا یہ مفہوم انسان پر یہ واضح کرتا ہے کہ اُسے اس دنیا میں رہتے ہوئے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

کلمۂ پاک کو اس مفہوم کے مطابق اسے قبول کرنے سے انسان پر یہ لازم ہو

جاتا ہے: کہ۔

انسان اس اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے اپنا اِلٰہ اور حاکم و بادشاہ تسلیم کیا ہے۔

اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی چھوڑ دے۔

اپنے جسم، اپنی جان، اپنے اعضاء، اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو اللہ کی ملکیت اور اپنے پاس امانت سمجھے۔

اپنے آپ کو اللہ ہی کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار سمجھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی مستقل بالذات پیشوا اور راہنما تسلیم نہ کرے۔ دوسرے تمام انسانوں کی اطاعت یا پیروی کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے تحت کرے نہ کہ ان سے آزاد۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے

کلمہ پاک کے ان تقاضوں کو ذہن میں تازہ کرنے سے انسان کا تعلق ایک طرف تو خدا تعالےٰ کی اس عظیم ہستی سے جڑ جاتا ہے جو اس کائنات میں اقتدار کی واحد مالک ہے۔ اور دوسری طرف انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی یکسوئی اور حقیقت شناسی انسان کے دل کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور خدا پر ایمان انسان کو اُن تمام فوائد سے مالا مال کر دیتا ہے جن کا ذکر ایمانیات کے باب میں کیا گیا ہے۔

شرط دوئم — زندگی کا نصب العین

اطمینانِ قلب کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کے لئے کوئی نصب العین مقرر کرے۔ یہ نہ ہو کہ اس کی یہ قیمتی زندگی بے مقصد اور بلا سوچے سمجھے گذر رہی ہو، اس کی زندگی کی مثال سمندر میں ایک ایسی کشتی کی مانند ہو جو بغیر پتوار کے چل رہی ہو اور جب مغرب کی طرف سے کسی تیز ہوا کا جھونکا آئے تو وہ اُسے اپنی طرف بہا کر لے جائے اور شمال وجنوب سے آنے والے جھونکے اُسے اپنے ساتھ لے جائیں بلکہ اس کی زندگی کا کوئی واضح راستہ اور نصب العین مقرر ہونا چاہیئے جس پر وہ ثابت قدمی سے چل سکے اور اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں اور مادی و روحانی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

اگرچہ فطری طور پر تو ہر انسان کی یہ کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کوششیں اور صلاحیتیں ایسے کاموں میں صرف ہوں، جن کے نتیجہ میں اس کی زندگی امن وسکون اور خوشی واطمینان سے گذرے۔ مگر غلط اور ادھورے نصب العین اُسے اطمینان سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔

نصب العین کے معاملہ میں بھی خدا پر سچا ایمان انسان کی راہنمائی کرتا ہے اور اس کی زندگی کا ایک نصب العین مقرر کر دیتا ہے کہ جس خدا نے اُسے زندگی دی ہے اور اس زندگی کے لئے ہر طرح کے سامان ووسائل فراہم کئے ہیں۔ اس زندگی کا نصب العین بھی خدا کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہونا چاہیئے اور اس کی ساری زندگی اس کوشش میں گذرنی چاہیئے کہ اس کا

خدا اُس سے راضی ہو جائے اور اس زندگی کے بعد اسے ابدی زندگی کے انعامات سے نوازے۔ یہ نصب العین اختیار کرنے کے بعد اس کی زندگی پکار اٹھتی ہے۔

"اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بے شک میری نمازیں، میری قربانیاں، میرا مرنا اور میرا جینا، سب کچھ اُس اللہ رب العٰلمین کی خوشنودی کے لئے ہے"۔

عام طور پر دنیا طلبی اور حبِ عاجلہ یعنی جلدی حاصل ہو جانے والے فائدہ کی وجہ سے لوگ اس نصب العین کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ مال تو کما لیتے ہیں مگر یہ مال ان کو اطمینان نصیب نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسلام نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی نگاہیں صحیح نصب العین پر ہی مرتکز رہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے

اے فرزندِ آدمؑ! میری بندگی اور عبادت کے لئے فارغ ہو جا۔ میں تیرے قلب کو تونگری سے بھر دوں گا اور تجھے تیری تلاشِ معاش میں تیری کوششوں کے حوالہ نہ کر دوں گا اور میرے ذمّہ ہوگا کہ میں تیرے فاقہ کو روکوں۔ تیرے قلب میں اپنا خوف پیدا کر دوں گا (جس سے تو اطمینان قلب حاصل کرے گا) اگر تو میری عبادت کے لئے فارغ نہ ہوگا تو میں تیرے قلب کو شغلِ دنیا سے بھر دوں گا۔ پھر اس دنیا سے بھی تجھے محروم کر دوں گا اور تجھے تیری تلاشِ معاش کے حوالہ کر دوں گا۔

پیرانِ پیر سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"بیٹے جس شخص نے یقین کی آنکھ سے پہچان لیا کہ رزق اللہ تعالیٰ کے ذمّہ ہے۔ وہ حیا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگتا۔ وہ اس سے رزق مانگنے

کی بجائے اس کے ذکر میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اپنے نصیب کے لئے سوال میں جلدی نہیں کرتا (کیوں کہ اس کا نصیب تو مقررہ وقت پر اُسے مل کر ہی رہتا ہے نہ دوسروں کے نصیب (حصّہ) کے لئے سوال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے مل نہیں سکتا) وہ حسنِ ادب اور ترکِ اعتراض کی عادت ڈالتا ہے۔ اس کے پاس تھوڑا رزق ہو یا زیادہ۔ وہ اس کے بارے میں لوگوں سے شکایت نہیں کرتا اس طرح اس کا دل تونگری سے بھرا رہتا ہے۔"

حکایت

ایک عارف باللہ کی حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک روز اس کے دروازہ پر دستک ہوئی، جب کہ وہ ذکرِ الٰہی میں مشغول تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک حسین وجمیل عورت آرائش وزیبائش سے آراستہ اُس کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ وہ اُس سے کہنے لگی کہ میرا نام "دولت" ہے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ میں کبھی کسی کے دروازہ پر جاتی ہوں اور کبھی کسی اور کے دروازہ پر چلی جاتی ہوں۔ اس لئے آپ مجھے اپنے گھر میں پناہ دیں۔

عارف باللہ نے علم وحکمت کی نگاہ سے اُسے غور سے دیکھا اور کہا کہ تو میرے دروازہ سے دُور ہٹ جا کیونکہ تو جس کے پاس بھی جاتی ہے اُسے بھی اندھا کر دیتی ہے اور جب وہ تیرے نشہ میں اندھا ہو جاتا ہے تو تُو بھی اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے ہاں چلی جاتی ہے۔ اس لئے مجھے معاف کر میرے لئے بقدرِ ضرورت رزق ہی کافی ہے اور زیادہ کی مجھے تمنا نہیں ہے۔

اسلام اس طرح کی حکمت بھری باتوں سے دنیا پرستی، مادیت اور حُبِ عاجلہ کے جذبات کی حوصلہ شکنی کر کے اس کے ذہن کو خدا پرستی اور خدا کی رضا کے نصب العین کے لئے تیار کرتا ہے اور یہی اطمینانِ قلب کا راستہ ہے۔

شرطِ سوئم ـ انشراحِ صدر

جب انسان ایمانیات کا صحیح شعور حاصل کر کے، اپنے دل سے بھی ان کی صداقت کی تصدیق کر دیتا ہے ـ تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک نفسِ مطمئنہ عطا فرما دیتے ہیں جس کی بدولت اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی خوشنودی اور رضاء الٰہی کا حصول قرار پاتا ہے۔ اور اس کی نگاہ میں دوسرے سارے مقاصد ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور وہ زندگی کے ہر معاملہ میں رضاء الٰہی کو اوّلین مقام دینے لگتا ہے اس طرح اُس کے لئے "اطمینانِ قلب" کے راستے کُھل جاتے ہیں۔

انسان کا یہ "نفسِ مطمئنہ" ترقی کرتے کرتے اُسے "انشراحِ صدر" کے مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ جو اطمینانِ قلب کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

"انشراحِ صدر" کی یہ نعمت جب کسی انسان کو میسّر آجاتی ہے تو حق کی پاسداری اور نیکی پر ثابت قدم رہنے کے لئے اس کے دل میں حوصلہ ہمت اور عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہری مصیبتوں، مشکلات، مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود، حق کے راستہ پر ہنستے کھیلتے وہ بڑی بڑی قربانیاں کر گزرتا ہے۔

"اطمینانِ قلب" بھی بڑی دولت ہے۔ مگر یہ "انشراحِ صدر" اس سے بھی کہیں زیادہ کیف آور چیز ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو اور صلحائے امت کو "اطمینانِ قلب" کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام پر یہ "انشراحِ صدر" کی کیفیت بھی حاصل رہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنانے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے دربار میں جا کر اسے خدا کی بندگی کی دعوت دینے کا حکم دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی۔

"رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ"

"اے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے (سورہ طٰہٰ آیت ۲۵ - ۲۶) میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر "انشراحِ صدر" کی دعا مانگی تھی۔

"رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ"

"میرے رب میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے۔"

سورۂ الم نشرح" میں اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کی اس کیفیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بڑا انعام قرار دیا ہے۔

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ؕ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝"

"اے نبیؐ - کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا اور اس (انشراح صدر) کی وجہ سے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیئے جو تمہاری کمر توڑ رہے تھے اور تمہارے ذکر کو بلند کر دیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ہر تنگی اور مشکل کے بعد فراخی ہے بے شک ہر تنگی کے بعد فراخی ہے۔ لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت میں لگ جاؤ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جاؤ۔"

"شرح صدر" کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے ذہنی خلجان اور شک شبہ سے پاک ہو کر۔ اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور اسلام کا دیا ہوا نظامِ زندگی ہی صحیح نظامِ زندگی ہے۔

اسی "شرح صدر" کا یہ اعجاز تھا کہ ابتدائی دور کے مسلمان، آگ کے دہکتے انگاروں پر لٹائے جانے کے باوجود، اسلام کے راستہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے اور جب کبھی بادشاہوں کے درباروں میں پہنچے تو اُن کے قالینوں کو نیزوں سے چھلنی کرتے ہوئے بلا تامل اُن کی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے، اور ایک بادشاہ نے جب ان کی اس حرکت کو زیادہ ہی بُرا منایا اور اظہارِ ناراضگی کے لئے اسلامی سفیر کے سر پر مٹی کی بھری ٹوکری رکھوا کر بطور تحقیر اپنے دربار سے رخصت کیا تو اس مومن نے اس مٹی کی بھری ٹوکری کو نیک شگون کے طور پر خوشی سے اپنے سر پر اٹھا لیا کہ اس بادشاہ نے تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی سرزمین ہمارے حوالہ کر دی ہے اور پھر وہ ملک مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو کر رہا۔

مسلمانوں کے دلوں میں "شرح صدر" کی یہ کیفیت ہر زمانہ میں اپنے کرشمے دکھاتی رہی ہے۔ ابھی ۱۹۷۷ء میں تحریک نظامِ مصطفےٰ کی خاطر جو نوجوان، بوڑھے، عورتیں، بچے، علماء، وکلاء، طلباء، تاجر اور مزدور میدان میں نکلے تھے اور اپنی چھاتیاں گولیوں کے سامنے کھول دی تھیں، عورتوں، بچوں، طلباء، علماء، وکلاء اور مزدوروں نے اپنے سروں پر جو ڈنڈے کھائے تھے۔ یہ اسی شرح صدر کا کرشمہ اور اسلام کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ ہی تو تھا۔ مسلمان قوم کے لئے جہاد اور قربانیوں کے یہ جذبات بڑے قیمتی جذبات ہوا کرتے ہیں جو قوموں کی قسمتیں بدل دیا کرتے ہیں۔ مگر کچھ تو ہمارے بعض راہنماؤں نے ہماری ان قربانیوں سے

غداری کی اور اتفاق و اتحاد کو نقصان پہنچایا اور رہی سہی کسر ہمارے کرسی نشینوں نے پوری کردی۔ اللہ ہمیں ہدایت کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے "شرح صدر" کی اس کیفیت کے متعلق آٹھویں صدی ہجری کے مشہور علامہ حافظ ابن قیمؒ جو حضرت امام تیمیہؒ کے شاگرد اور ہم عصر تھے۔ اپنی کتاب "زاد المعاد میں لکھا ہے کہ:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ

"مُنْشَرِحُ الصَّدْر"

"مُطْمَئِنُ النَّفْس اور

"مَسْرُورُ القلب" تھے

آپ نے اپنی زندگی میں ہر طرح کے نشیب و فراز دیکھے۔ اگرچہ دیگر انبیاء علیہم السلام بھی صبر و استقلال اور عزیمت کے پیکر تھے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میدان میں بھی خاص امتیاز حاصل ہے۔

جتنے مصائب اور مشکلات سے بھی آپؐ کو سابقہ پیش آیا۔ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

آپؐ اپنی پیدائش سے دو ماہ قبل یتیم ہو گئے

چھ ماہ کی عمر کو پہنچے تو والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا

والدہ ماجدہ کے بعد آپ کے دادا نے پرورش کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی انتقال کر گئے۔

۲۵ سال کی عمر میں آپؐ کی شادی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی جن کی عمر ۴۰ سال تھی۔

۴۰ سال کی عمر میں جب آپؐ نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا تو کفار مکہ نے سخت مخالفت کی اور آپ کو ذہنی اور جسمانی تکالیف پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

تبلیغِ اسلام کے اس کام میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اور آپ کے چچا ابوطالب نے آپؐ کا ساتھ دیا۔ لیکن دسویں سال نبوی میں وہ دونوں بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ جس سے آپ کو شدید صدمہ پہنچا۔ آپ نے اس سال کو عام الحزن یعنی غم کا سال کہتے ہیں۔

آپ کو اولاد کی فوتیدگیوں کے غم بھی سہنے پڑے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے سوا آپ کی تمام اولاد آپ کے سامنے فوت ہوئی لیکن آپ صبر کے پیکر بنے رہے۔

آپ کے بیٹے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ کا دل غمگین ہوا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپکے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے رہے کہ ہم اپنے رب کی مرضی پر راضی ہیں اور ہمارے یہ آنسو تو اس رحمت اور محبت کی علامت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے دلوں میں اولاد کے لئے رکھ دی ہے۔

غزوۂ احد میں آپ کے چچا سید الشہدا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تو کافرہ عورت ہندہ نے ان کا جگر نکال کر دانتوں سے چبا ڈالا اور آپ کے اعضاء کاٹ دیئے۔ جس سے آپ کو بے انداز صدمہ ہوا لیکن آپ نے اُس ظالم اور شقی القلب عورت کو بھی بالآخر معاف فرما دیا۔ صلّی اللہ علیہ وسلم۔

غزوۂ احد اور دوسری لڑائیوں میں متعدد صحابہؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ مگر حضورؐ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ جنگِ اُحد میں آپ پر بھی تیر

برسائے گئے اور پتھر پھینکے گئے جس سے آپ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے لیکن آپ کی زبانِ مبارک سے اُن دشمنوں کے حق میں بھی یہ الفاظ نکلے۔

"اے اللہ ان کو معاف فرمایئے۔ یہ نادان ہیں۔"

آپؐ کی فتوحات

آپؐ نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے ان تمام مصائب و آلام کو انسانی زندگی کے ناگزیر معمولات کے طور پر قبول کیا اور ان ناموافق ذاتی یا خاندانی حالات کو اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد میں سنگِ راہ نہیں بننے دیا۔

مکہ شریف سے ہجرت کے بعد آپ نے مدینہ شریف کے قیام کے دوران ۲۷ جنگیں لڑیں اور ۳۵ جنگی نوعیت کی مہمات روانہ کیں۔ آپؐ کے مفتوحہ علاقہ کو اگر دنوں میں تقسیم کیا جائے تو ۲۷۴ مربع میل یومیہ بنتا ہے آپؐ کا اپنا نقصانِ جان صرف ایک جان ماہانہ ہے اور دشمن کا ۱۵۰ جانیں ماہانہ۔ آپ نے دس سال میں دس لاکھ مربعہ میل سے زیادہ علاقہ اسلام کے لئے فتح کیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

آپؐ کی اتباع میں ہر دور کے بزرگانِ دین اور سچے مسلمانوں نے اسی اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر کی کیف و مستی میں آپ کے نقشِ قدم پر چلتے رہنے کی کوشش کی۔

شرحِ صدر کے حصول کا طریقہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ آپ سے جو دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ اُن میں خاص طور پر ان کیفیات کی طلب

جھلکتی ہے۔

۱۔ دعا:۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ وَیَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَرِضًا مِّنَ الْمَعِیْشَۃِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ۔

ترجمہ:۔ اے اللہ میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے۔ وہ سچا یقین مانگتا ہوں۔ جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی۔ جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے اور مقررہ رزق پر دل کی رضا مندی آپ سے مانگتا ہوں۔

۲۔ دعا:۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّاَعْطِنِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا

ترجمہ: اے اللہ میرے دل میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرما اور مجھے سراپا نور بنا دے۔

فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

جب نور دل میں آتا ہے تو اس میں کشادگی پیدا ہوتی ہے (جس سے دلوں کو اطمینان اور سینوں کو فراخی ملتی ہے)

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی:۔

یا رسولؐ اللہ اس کی نشانی کیا ہے!

آپ نے فرمایا:۔

جب تمہارے دل میں

آخرت کی طرف رغبت۔

دنیا سے نفرت

موت سے پہلے کی تیاری کی فکر پیدا ہو جائے تو تُو سمجھ لے کہ تجھے اطمینان کی دولت اور شرح صدر کی کیفیت حاصل ہو گئی۔

شرط چہارم — تفویض اِلی اللہ

اطمینان قلب کے لئے چوتھی شرط "تفویض الی اللہ ہے۔" تفویض الی اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے تمام امور اور معاملات کا انجام اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا انتظام و انصرام بلا شرکتِ غیرے خالصتاً اپنی مرضی سے چلا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تدابیر اور منصوبے تمام مخلوقات کی تدابیر اور منصوبوں پر غالب رہتے ہیں اور کائنات کے تمام معاملات میں اصل کارفرما اور فیصلہ کن قوت مشیت الٰہی ہی ہوتی ہے۔ کسی انسان کی کوئی تدبیر کوشش اور محنت اس وقت تک کامیاب، بار آور اور ثمر آور نہیں ہو سکتی جب تک اُسے اللہ تعالیٰ کی (Approval) منظوری حاصل نہ ہو جائے۔

اس لئے انسان کا کام تو فقط یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی قوت اور ذرائع و وسائل کے مطابق ہر کام کے لئے ضروری تدابیر اختیار کر کے اس کا انجام اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ کی مشیت میں ہو گا اُسے مل کر رہے گا، اس قسم کی سپرد داری پر ایک مومن کو اطمینان اس وجہ سے حاصل رہتا ہے کہ جس خدا کے سپرد اُس نے اپنا کوئی کام کیا ہے اور اس کے لئے اُس نے اپنی استطاعت کے مطابق ضروری تدابیر بھی اختیار کر لی ہیں۔ اس کا خدا ان کوششوں کی قدر دانی کرنے والا ہے اور اپنے بندوں پر رحیم و شفیق بھی ہے اور کسی کے ساتھ بے انصافی یا زیادتی کر کے راضی بھی نہیں ہوتا ہے۔ اپنے بندوں کی محنت کی

قدر دانی کرتے ہوئے ایک کے بدلے کئی گنا عطا کر کے خوش ہوتا ہے اور رحم اور بخشش اس کا شیوہ ہے۔ اس کے ہاں اگر کوئی شخص محروم لوٹتا ہے تو وہ بھی اس کی وسیع تر حکمتوں کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

خدا پر اعتماد توکل اور سپرد داری کے یہ جذبات انسان کے دل کو اطمینان سے سرشار کر دیتے ہیں۔

قرآن پاک میں کئی واقعات اور مثالیں بیان کر کے انسان کو اس طرزِ عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔

سورۃ کہف میں "ایک ایسے شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس کو دنیوی لحاظ سے ہر طرح کی خوشحالی کا سامان میسر تھا۔ اس کے پاس انگوروں کے دو باغ تھے جو پھلوں سے خوب لدے ہوئے تھے۔ اُن کے چاروں طرف کھجوروں کے دلنواز درخت تھے جنہوں نے اس باغ کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور ان دونوں باغات کے درمیان میں ایک نہر بھی جاری تھی"۔

اپنے ان خوبصورت اور نفع بخش باغات کی وجہ سے اپنے رب کو بھول گیا تھا اور وہ نادانی کی وجہ سے اپنی ساری خوشحالی اور خوش بختی کو اپنے علم و لیاقت اور اپنی ذہانت کی طرف منسوب کرتا تھا۔ اس نے اپنے ایک خدا پرست دوست سے فخریہ انداز میں کہا۔

أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا (سورہ کہف ۳۴)

۔ دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرے پاس کارندے بھی زیادہ ہیں۔ یہ باتیں کرتا ہوا وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور کہہ رہا تھا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے اور مجھے یہ امید نہیں کہ قیامت بھی کہیں آئے گی۔

• یہ باتیں سن کر اس کے دوست نے کہا اور وہ باہم باتیں کرتے جا رہے تھے۔ کہ کیا تم اُس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کرنے کا طریقہ مقرر کیا اور پھر آدمی بنا کر ظاہر کر دیا۔ اور میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی خدا میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے اور اس کی شادابیاں دیکھیں تو تم نے یہ کیوں نہ کہا۔ ماشاء اللہ و لاقوۃ الا باللہ"
وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔
اگر تم مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہے ہو تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرما دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اُسے کسی طرح نہ نکال سکے: (پارہ ۱۵ سورہ کہف)
اور آخر کار یہی ہوا۔ خدا کی بھیجی ہوئی ایک آندھی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لہلہاتے باغ ایک چٹیل میدان بن گئے۔
قرآن کے اس قصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی مشیت ہر کام پر غالب ہے اس لئے ایک مومن کو اپنے تمام امور کا انجام خدا کے ہی سپرد کرنا چاہیئے۔
پیران پیر سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں تفویض الی اللہ" کی خوب تشریح فرمائی ہے۔ آپ کے ارشادات کا مفہوم یہ ہے۔
"جب کسی مومن بندہ کو کوئی کٹھن کام پیش آتا ہے یا اس پر کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو پہلے وہ خود اس کام کو کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس مصیبت سے

نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا تو مخلوقات میں سے دوسروں سے مدد مانگتا ہے مثلاً بادشاہوں سے، حاکموں سے، دُنیاداروں سے امیروں سے اور بیماری کی صورت میں طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اُس وقت اپنے پروردگار کی طرف دُعا اور گریہ وزاری، حمد وثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ پھر جب خدا کی طرف سے بھی کوئی مدد نظر نہیں آتی یا دُعا قبول نہیں ہوتی تو پھر بھی اُسی کی چوکھٹ پر پڑا رہتا ہے اور ہمیشہ اسی سے سوال و دُعا اور گریہ وزاری و اظہارِ حاجت مندی امید وبیم کے ساتھ کرتا رہتا ہے اور راضی برضا ہو جاتا ہے اور قطعی طور پر جان لیتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی کچھ کرنے والا ہے اور نہ اُس کے سوا کسی کے ہاتھ میں کوئی نفع و نقصان، کشائش و بندش، عزت و ذلت یا موت و زندگی ہے۔ اس طرح سے وہ اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی سپرداری میں دے کر بے فکر ہو جاتا ہے اور اس تفویض الی اللہ اور انشراحِ صدر سے اُسے کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔

شرطِ پنجم — ترکِ منافقت

اطمینانِ قلب کے لئے پانچویں شرط یہ ہے کہ انسان جس دین و مذہب پر ایمان رکھتا ہو، اس کے تمام احکام کی پابندی کرے، اس کی زندگی "اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" کا نقشہ پیش کرتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ اسلام کے بعض احکام کی تو پابندی کرتا ہو اور بعض کا انکار کرتا ہو۔ ایک طرف وہ اپنے خدا کو بار بار یقین دلاتا ہو کہ وہ اُسی کا بندہ ہے اور اُسی کی عبادت کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ہر

اُس بُت کی پوجا کرتا ہو جس کے ساتھ اس کا کچھ بھی مفاد وابستہ ہو۔

مسلمانوں کے اندر نفاق اور منافقت کی یہ کیفیت اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ ایک مدت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ تم توحید و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور روزہ و نماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کر لینے کے بعد خواہ کتنے ہی دین و ایمان کے خلاف طرزِ عمل اختیار کر جاؤ، نہ تمہارے اسلام پر کوئی آنچ آ سکتی ہے اور نہ تمہاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اس ڈھیل (Allowance) کی حدود اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لئے شرط نہیں رہا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ کر دیا گیا ہے کہ ایک طرف ایمان و اسلام کا اقرار ہو اور دوسری طرف ساری زندگی اُس کے خلاف گذر رہی ہو، تب بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلام کے نام کے ساتھ ساتھ ہر فسق و فجور، کفر، نافرمانی اور معصیت، ظلم و سرکشی کا نباہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

مسلمان مشکل سے ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات اپنی محنتیں، اپنے مال اور اپنی صلاحیتیں کھپا رہے ہیں۔ وہ بیشتر اُن کے ایمان کی ضد ہیں۔ اِس قسم کی دورنگی اور منافقت کے ہوتے ہوئے بھلا اطمینان کیسے مِل سکتا ہے۔

منافقت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ انسان جس دین و مذہب پر ایمان رکھتا ہو اُس کے بالکل خلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر مسلط پا کر راضی اور مطمئن رہے ایک قانون کو برحق جانتا ہو مگر اُس کے خلاف چلنے والے قوانین پر کوئی بے چینی محسوس نہ کرے اور اُن غلط قوانین کو بدل کر اپنے دین کو اُن کی جگہ قائم کرنے کی کوشش نہ

کرے۔ یہ طریقہ اور طرزِ عمل سراسر منافقانہ ہے کہ انسان ایمان تو ایک نظامِ زندگی پر رکھتا ہو مگر راضی کسی دوسرے نظامِ زندگی پر رہے۔ حکومت کا نظام بھی اور اس کی زندگی کے سارے معاملات تو اُس کے پسندیدہ دین کے خلاف چل رہے ہوں مگر اس کا ایمان پھر بھی خوش اور مطمئن رہے۔

اس نفاق کے بعد دوسری خطرناک چیز جس کو ترک کرنا چاہیئے وہ تناقض یعنی (INCONSISTENCE) ہے۔ تناقض کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس چیز کا زبان سے دعوے کرے عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔ یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا عمل ایک معاملہ میں کچھ ہو اور دوسرے معاملہ میں کچھ اور ہو۔ جب انسان نے اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دے دی ہے اُسے تو کوئی ایسی حرکت زیب نہیں دیتی جو بندگیٔ رب کی ضد ہو، ایک طرف وہ مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھے اور دوسری طرف مسجد سے نکلتے ہی اپنے گھر میں اپنے لین دین میں اپنی تلاشِ معاش میں، اپنے شادی بیاہ میں اپنی شکل و صورت اور رہن سہن میں خدا کی شریعت کو بھول جائے

اس قسم کی منافقت، دورنگی اور تناقض کو ترک کر کے ہی انسان اپنی زندگی یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ بسر کر سکتا ہے۔

شرطِ ششم، ذکرِ الٰہی

اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے چھٹی اور آخری شرط یہ ہے کہ ہم "ذکرِ الٰہی" کی پابندی کریں۔ اور کسی لمحہ بھی اس سے غافل نہ رہیں۔ ذکر کے اُن تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھیں جن کا ذکر باب یازدہم میں کیا گیا ہے۔

کیوں کہ یہ "ذکرِ الٰہی" ہی دراصل ہمارے رُوح کی غذا ہے۔ جس سے

انسان کا جسم، نفس، قلب اور رُوح اطمینان سے سرشار رہتا ہے۔ ○

دس ضروری باتیں

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں کہ تمہارے دِل دس چیزوں کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہیں

۱۔ خدا کی ذات وصفات پر ایمان لانے کے باوجود تم اس کے حکموں کو توڑتے ہو۔

۲۔ خدا کی کتاب پڑھتے ہو اور اس کو پسِ پشت ڈال دیتے ہو۔

۳۔ شیطان سے دشمنی کا اعلان تو کرتے ہو لیکن چلتے اسی کی راہ پر ہو

۴۔ محبّتِ رسولؐ کا دعویٰ کرتے ہو لیکن آپ کی سنّتوں پر عمل نہیں کرتے

۵۔ جنّت کے آرزو مند وطالب تو ہو لیکن اس کے لئے عمل نہیں کرتے

۶۔ دوزخ کا خوف تو ظاہر کرتے ہو مگر معاصی سے اجتناب نہیں کرتے

۷۔ تم جانتے ہو کہ موت یقینی ہے مگر اس کے لئے تیاری نہیں کرتے،

۸۔ دن رات غیروں کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہو مگر اپنے عیوب پر نظر نہیں جاتی

۹۔ خدا کا دیا ہوا رزق کھاتے ہو لیکن اس کا شکر نہیں ادا کرتے،

۱۰۔ تُم اپنے مُردوں کو قبر میں اتارتے رہتے ہو مگر اس سے ذرا بھی عبرت نہیں حاصل کرتے،

ایک مُطمئن اور پرسکُون زندگی کا نقشہ

ایمان ○ یقین ○ توکل

خدا سے محبت

خدا کی معرفت

رجوُع الی اللہ

تقدیر پر یقین

اطمینانِ قلب کے موضوع پر ہم نے اس کتاب کے مختلف ابواب میں جو بحثیں کی ہیں، ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔

اب ہم حاصلِ بحث کے طور پر آپ کے سامنے ایک مطمئن اور پُر سکون زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو اطمینانِ قلب کے لئے راہنمائی مل سکے

دنیا میں بے شمار اہلِ علم، اربابِ فن، فلاسفر، محقق اور دانشور موجود ہیں، طاقت اور قدرت رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ حسن و جمال کے پیکر بھی پائے جاتے ہیں۔ قارون کی طرح بے حد و حساب خزانوں کے مالک بھی ہیں، امیروں وزیروں اور بادشاہوں کے اقتدار کا ڈنکا بھی بج رہا ہے۔ مگر وہ ان تمام صفات کے باوجود الّا ماشاء اللہ" اطمینانِ قلب" سے محروم ہیں کیوں کہ یہ چیزیں "اطمینانِ قلب" کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

"سکونِ قلب" کی جنسِ نایاب کا منبع صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ایمان باللہ" ایسا ایمان جو سچا بھی ہو اور گہرا بھی۔ جسے شک یا غفلت نے مکدر نہ کر دیا ہو اور جس میں نفاق بھی پیدا نہ ہو چکا ہو۔

سکینت عطیہ ربانی ہے جو اہلِ زمین میں سے صرف اہلِ ایمان کے دلوں پر نازل ہوتی ہے تاکہ جب لوگ بے چین اور مضطرب ہوں تو وہ خاطر جمع رکھیں جب لوگ غضبناک ہوں تو وہ صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ جب لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں تو وہ یقین و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوں۔

ایک مومن ہمیشہ فطرت کی آواز پر لبیک کہتا ہے، اس کے افکار و اعمال فطرت سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی فطرت دو چیزوں سے عبارت ہے۔

ایک مُشت خاک
دوسری رُوح پاک

وہ ہر معاملہ میں جانبِ خاک ہی نہیں جھکا رہتا۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اندھی مادہ پرستی کے پاس اس کی زندگی کے دُکھوں اور پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ مادی ضروریات کے ساتھ ساتھ اپنی رُوح کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے، کیوں کہ سکون کی نعمت تو اُسے رُوح کی تسکین میں ہی ملتی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے جسے رجوع الی اللہ سے ہی دور کیا جا سکتا ہے اسے وحشت لاحق ہوتی ہے جسے خدا کی محبت ہی زائل کر سکتی ہے اُس کے دل میں حزن و ملال گھر کر لیتا ہے جس سے خدا کی معرفت کا سرور ہی نجات دلا سکتا ہے۔ اس کا دل بے چینی اور اضطراب کا شکار ہو جائے تو اس کو ذکرِ الٰہی سے سکون اور قرار نصیب ہوتا ہے۔ اس میں حسرت کی آگ بھڑک اُٹھے تو تقدیر کا تصور اُسے بجھا دیتا ہے غرضیکہ دل کی یہ تمام بیماریاں اس وقت دُور ہوتی ہیں جب انسان اپنی فطرت کے مادی پہلو کی طرف نہیں بلکہ روحانی پہلو کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پس ایک مومن ہر وقت اس لیے پُرسکون رہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔

ایک مومن اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس زمین پر اس کا نائب اور خلیفہ بھی ہے۔ مالک نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہی اس کائنات کو پیدا فرمایا ہے اور وہی اس کی تدبیر و انتظام کرتا ہے۔ ایک وقت مقررہ تک اللہ تعالیٰ نے زمین کے کچھ وسائل اور خزانے انسان

کے قبضہ میں دے دیتے ہیں تاکہ اس کی آزمائش کر سکے۔ آخرت میں اُسے اپنے ایک ایک عمل کی خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہو گی۔ اور انسان اپنے اعمال کے بدلے میں قیامت تک اپنے خدا کے پاس رہن یعنی گروی رکھا رہے گا۔ اور آخرت اسی کی سدھرے گی جس کے اعمال اچھے ہوں گے۔

اس ایمان سے محروم لوگوں کی زندگی اس لئے بھی غیر مطمئن ہوتی ہے کہ اُن کی منزل متعین نہیں ہوتی اور راستہ بھی غیر واضح ہوتا ہے۔ کبھی وہ ایک سمت کو چلنے لگتے ہیں۔ اور کبھی بالکل دوسری سمت میں۔ کبھی کسی ایک کو راضی کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو، اسی کشمکش میں اُن کی عمر گزر جاتی ہے اور شک اور تردد کی کیفیت سے لمحہ بھر کے لئے بھی اُن کو چھٹکارا نہیں ملتا۔

اُن کی مثال بالکل اس روایتی بوڑھے اور اس کے بیٹے کی طرح ہوتی ہے۔ جن کے پاس ایک گدھا تھا۔ جس پر سفر کے دوران پہلے بوڑھا سوار ہو گیا اور بیٹا پیدل چلنے لگا۔ قریب سے گزرنے والی چند عورتوں نے بوڑھے باپ کو ملامت کی کہ زندگی کی اتنی بہاریں دیکھنے کے بعد دنیا کے آرام سے اس کا جی نہیں بھرا ہے اور نو عمر بیٹے کو پیدل چلنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ باپ گدھے سے نیچے اُتر آیا اور بیٹے کو گدھے پر سوار کر لیا۔ ابھی چند ہی قدم آگے گئے تھے کہ کچھ آدمی بیٹے کو کوسنے لگے۔ کہ دیکھو اس جوان کو شرم نہیں آتی، خود تو گدھے پر سوار ہے اور اس کا باپ پیدل چل رہا ہے، آخر باپ بیٹا دونوں گدھے پر سوار ہو گئے۔ تو کچھ اُس غریب گدھے کے ہمدرد آ گئے اور اُن دونوں سے گدھے پر رحم کرنے کی اپیل کرنے لگے کہ گدھا تمہارے بوجھ سے پریشان ہو رہا ہے۔ یہ سُن کر دونوں گدھے سے نیچے اُتر آئے اور پیدل چلنے لگے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے

کیا تھا کہ بعض دانشور اُن کو بے وقوفی کا طعنہ دینے لگے۔ اس پر باپ بیٹے نے رسیوں سے گدھے کو باندھ کر اپنے سر پہ اٹھا لینے کا فیصلہ کیا کہ شاید اس طرح لوگ راضی ہو جائیں مگر لوگوں نے کیا راضی ہونا تھا۔ ایک ندی عبور کرتے وقت گدھے نے ندی میں چھلانگ لگا دی اور اُن دونوں کو لے ڈوبا۔ مگر دنیا والے اُن سے کسی طرح بھی راضی نہ ہو سکے۔

ٹھیک یہی حالت اُن لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو ایمان و یقین سے محروم ہوتے ہیں اور خدا کی رضا مندی کے راستہ کو چھوڑ کر ہر ایک کو راضی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ کسی کو بھی راضی نہیں کر پاتے۔ اس کے برعکس ایک مومن یکسوئی کے ساتھ خدا کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر چل رہا ہوتا ہے۔ اُسے صرف اپنے رب کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور اس منزل کو پا لینے کا یقین اُسے ہر قدم پر مسرور رکھتا ہے پھر ایک مومن جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اور جس قسم کے بھی حالات میں ہوتا ہے۔ اس کا یقین و ایمان اس بات پر پختہ رہتا ہے کہ اس کا خدا اس کے ساتھ ہے اور اس کی مدد پر قادر ہے اور اُسے ہر مصیبت اور مشکل سے بچا سکتا ہے

• وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

(سورہ الحدید۴)

"وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اُسے وہ دیکھ رہا ہے"

معیتِ الٰہی اور نصرتِ الٰہی کی یہ کیفیت ہر مومن کے دل میں موجزن رہتی ہے۔ جو اس کے سکون و اطمینان کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

سکینت کے جن ذرائع و اسباب تک مادہ پرستوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ ان میں

سے ایک نماز اور دُعا بھی ہے۔ نماز مومن کا وہ کارگر ہتھیار رہا ہے۔ جس سے آلام و مصائب میں مدد حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" (سورۃ البقرہ ۱۵۳)

یعنی اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرنے کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ صبر و نماز ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشان کن مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ نماز کا اہتمام فرماتے اور اپنے حقیقی آقا کے سامنے عرضِ مدّعا کرتے۔

یہ نماز اور دعا، کمزور، ناتواں اور مصیبت زدہ انسان کا تعلق اُس ذات سے جوڑ دیتی ہے جو علیم و خبیر اور علیٰ کلِّ شیءٍ قدیر ہستی ہے جس کا دروازہ ہر وقت کھٹکھٹایا جاسکتا ہے اور ہر وقت کھلا ملتا ہے۔ جس کے درِ رحمت و شفقت سے محروم لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

انسان کی بے چینی اور اضطراب کی وجوہات میں سے ایک وجہ۔
زمانۂ ماضی کے مصائب اور ناموافق حالات کا غم
زمانۂ حال کی خاک میں ملتی ہوئی اُمنگیں۔

مستقبل کے موہوم خطرات کا احساس ہوتا ہے۔ بعض لوگ ماضی کے نقصانات کو دل میں بٹھا لیتے ہیں اور سالہا سال کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں۔ آہیں بھرتے اور نالہ و فریاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ماضی کی تلخ یادیں ان کے زمانۂ حال کو بھی مکدّر کردیتی ہے، یہ تلخیاں دراز ہوکر ان کے مستقبل پر بھی اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اُن کی پوری زندگی پر مایوسیوں کے گہرے اور تاریک سائے پڑنے لگتے ہیں اور ایک دائمی حسرت و افسوس کی کیفیت ان پر مسلط ہو جاتی

ہے۔

انسان کی زندگی کی بربادی کا یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کی سوچ کا انداز یہ بن جاتا ہے کہ اگر میں یوں کرتا تو ایسا نہ ہوتا، اگر میں بیمار نہ ہوتا تو اس تکلیف یا انجام سے بچ جاتا۔ ہائے میرا فلاں عزیز نہ مرتا۔ کاش اس وقت مجھے یہ بات سوجھ جاتی۔ یہ کاش اگر اور ہائے کے الفاظ دنیائے حسرت کی وہ پرچھائیاں ہیں جو ہر خدا سے غافل اور مادہ پرست انسان پر پڑتی رہتی ہیں اور اُسے ایک اضطراب مسلسل میں مبتلا رکھتی ہیں۔

اس کے برعکس ایک مومن اپنی "کتاب ماضی" کی ورق گردانی اس طرح کبھی نہیں کرتا کہ اُسے پچھتاوا لگ جائے اور نہ وہ حال کی رنگینیوں اور سنگینیوں سے گزرتے ہوئے اپنی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل ہونے دیتا ہے کہ:

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌۚۖ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۙ

(سورہ الحدید۔ ۲۲۔ ۲۳)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (تقدیر) میں نہ لکھ رکھا ہو ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو، اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ تمہیں (نعمت) عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔"

اسس آسمانی تعلیم کے مطابق ایک بندۂ مومن کا یہ شعار (طریقہ) بن جاتا ہے کہ جب کوئی اُسے نعمت ملتی ہے تو "الحمدللہ" کہتا ہے۔ جب اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں کوئی موت فوت کا حادثہ پیش آتا ہے تو اس کی زبان پر

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

جاری ہو جاتا ہے کہ سب کچھ اللہ کا دیا تھا۔ ہم سب بھی اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ اور زمانۂ ماضی کے نقصانات اور خطرات کی یاس کو " مَا اَصَابَ مِن مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ "۔ "کسی پر کوئی مصیبت اس وقت تک نہیں آتی جب اللہ کو منظور نہ ہو"

کے یقین کی ضربِ کاری سے مٹاتا رہتا ہے۔

غرضیکہ سچے ایمان کی نعمت سے بہرہ ور انسان حسرت و افسوس کا کبھی شکار نہیں ہوتا۔ اور ایک سچے مومن کی زندگی ہر حال میں اطمینانِ قلب سے سرشار رہتی ہے۔

یہ اطمینانِ قلب دل کی ایک داخلی کیفیت ہے جو ہر مومن کو اس کی روحانی بالیدگی کی وجہ سے ایمان و یقین اور توکل کی بناء پر حاصل رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام قارئین کو ان حقائق کو سمجھنے اور دل میں جگہ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ تاکہ اُن کی زندگی کی کشتی اضطراب، بے چینی اور عدمِ اطمینان کے بھنور سے نکل کر ہمیشہ "اطمینانِ قلب" کے ساحل پر لنگر انداز رہے۔ آمین و ہزار بار آمین۔

بندۂ مومن کی شان

بندۂ مومن

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کُشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز
اُس کی امیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب، اس کی نِگاہ دلِ نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو،
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دلِ و پاک باز

(علامہ اقبالؒ)

باب ہشتم

اسلام

مغربی مفکّرین کی نظر میں

(جارج برنارڈ شاہ)

میں نے جب بھی محمد (صلعم) کے مذہب پر غور کیا ہے اسے بڑی قدر و منزلت سے دیکھا ہے۔ کیوں کہ اس دین میں بڑی حیرت انگیز زندگی ہے۔ میرے نزدیک محمدؐ کا دین ہی ایک ایسا دین ہے جس میں ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ بلاشبہ دنیا کو چاہیئے کہ میرے جیسے بڑے آدمیوں کی پیشنگوئیوں کی پوری طرح قدر و منزلت کرے اور میری پیشنگوئی دینِ محمدیؐ کی بابت یہ ہے کہ امروز و فردا میں یورپ اس کو قبول کرے گا۔ میں نے اس حیرت انگیز عظیم انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور یہ رائے رکھتا ہوں کہ وہ نہ حضرت عیسیٰؑ کے مخالف ہیں نہ عیسائیت بلکہ انہیں تو کل انسانیت کا نجات دہندہ سمجھنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر محمدؐ جیسا آدمی موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر بن جائے تو اسے موجودہ دنیا کی ان تمام الجھنوں کو سلجھا دینے میں ایسی کامیابی ہوگی کہ وہ دنیا کو وہ

مسرت و امن و راحت جس کی اسے آج اس قدر ضرورت ہے، میسر آجائے گی۔ گو دورِ حاضرہ کا یورپ بڑی زبردست ترقی کر گیا ہے۔ مگر انیسویں صدی میں تو یورپ کی اتنی ترقی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت بھی یورپ میں کارلائل۔ گوئٹے اور گبن جیسے دیانت دار مفکرین موجود تھے۔ جنہوں نے محمدؐ کے دین کی حقیقی قدر پہچانی۔ اس لئے ان کے زمانہ سے ہی اسلام کے ساتھ یورپ کا رویہ بدلنا شروع ہو گیا تھا، یہ ایک خوش آیند تبدیلی تھی۔ پھر یہ صدی آئی تو یورپ میں دینِ محمدیؐ کے ساتھ اور بھی قرب و انس پیدا ہونا شروع ہوا۔ بیسویں صدی تک یورپ کی اقوام کے قدم اس کی طرف زیادہ بڑھ جائیں گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یورپ اپنی الجھنوں کو حل کرنے کے سلسلہ میں محمدؐ کے دین کی افادیت کو اور زیادہ محسوس کرنے لگے گا۔

(جارج برنارڈ شاہ)

گھر سے قبر تک کے سفر کا ایک منظر

جس سے ہر انسان کو سابقہ پیش آتا ہے

— شورش کاشمیری کا سفرِ آخرت

اک مسافر تھا کچھ دیر ٹھہرا یہاں — اپنی منزل کو آخر روانہ ہوا
بات کل کی ہے، محسوس ہوتا ہے یوں — جیسے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا
آہ! کل تک تھا جو رونقِ زندگی — آج شہرِ خموشاں کی زینت بنا
جُراتوں کا، خودی کا دیا بجھ گیا — کاروانِ صحافت، خطابت اُٹھا

زندگی سے خفا ہو کے وہ چل دیا
جیتے جی جو کسی سے خفا نہ ہُوا

محفلوں کا جو نوشہ تھا دا حسرتا — قبر کا اُس کو دولہا بنایا گیا
ایک ماتم بپا ہو گیا ہر طرف — رُخ سے جب اس کے سہرا اٹھایا گیا

دشت و در رو دیئے بحر و بر رو دیئے
چڑھ کے کاندھوں پہ جب وہ روانہ ہوا

وہ جلوسوں کی صورت میں گزرا جہاں — اُن ہی رستوں سے اس کا جنازہ چلا
آگے آگے مسافر کی بارات تھی — پیچھے پیچھے زمانہ تھا روتا چلا
ایک شورش تھا اور گھر سے ایسے چلا
شہر کا شہر جیسے روانہ ہوا

لوگ شورش کے کتنے وفادار تھے — آہ! کیسی وہ اس سے وفا کر گئے
عمر بھر جن سے ان کی رفاقت رہی — ڈھیروں مٹی کے نیچے دبا کر گئے
دوست آنسو بہاتے گئے قبر تک
ساتھ اس کے نہ کوئی روانہ ہوا

جب اتارا لحد میں کہا کان میں — اب ہماری گلی میں نہ آنا کبھی
روزِ محشر ہی شورش ملیں گے تمہیں — حشر تک اب یہ لب نہ ہلانا کبھی
یہ سخن سُن کے وہ چُپ کا چُپ رہ گیا
ایک جملہ بھی اس سے ادا نہ ہوا

جسم مٹی سے ڈھانپا اُٹھے چل دیئے — دو قدم پر رُکے فاتحہ کے لئے
آئی اس کی لحد سے صدا دوستو — آپ آئیں گے پھر کب دُعا کیلئے
سب نے مل کر کہا جب بھی فرصت ملی
یا کوئی جب یہاں سے روانہ ہوا

تازہ وارد ہے شورش ابھی قبر میں — گھر نیا ہے طبیعت پریشان ہے
گو حمیدؔ اور حسرتؔ بھی پہلو میں ہیں — پھر بھی شورش کو حسرت ہے ارمان ہے

کیوں نہ یہ دم مدینے میں نکلا مرا
کیوں نہ یثرب میں میرا ٹھکانہ ہوا

کلمہ پڑھ کر کہا تھا دمِ آخریں — رہنما شاہد ہے شورش غلامِ نبیؐ
میرے رستے سے ہٹ جاؤ چارہ گرو — خُلد سے آگیا ہے پیامِ نبیؐ

جا رہا ہوں، بلایا ہے سرکارؐ نے
موت کا تو فقط اِک بہانہ ہوا

قبر میں آکے جس دم نکیرین نے — دیکھی فہرست شورشؔ کے اعمال کی
فتحِ ختمِ نبوت کے عنوان سے — تھی سند اس کے تابندہ افعال کی

رحمتوں کے ہنڈولے اُترنے لگے
باغِ جنت کو شورشؔ روانہ ہوا

اے مشیرِ حزیں آج شورشؔ نہیں — اس کا پیغام پڑھ کر سنا دے یہاں
جینے والو جیو، مثلِ شورشؔ جیو — مثلِ شورشؔ بیاں مثلِ شورشؔ زباں

مثلِ شورشؔ ہی شورشؔ ہو شورش بپا
دے کے پیغام شورشؔ روانہ ہوا

ــ ۞ ــ

۱. حمید نظامی مرحوم
۲. مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم

اسلامی جذبات کے موتی ، ایک شاعر کے تاثرات

قبرِ اقبالؒ پر

پھول لے کر گیا آیا روتا ہوا، بات ایسی ہے کہنے کا یارا نہیں
قبرِ اقبال سے آرہی تھی صدا، یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں

قبر پر قوم ساری تھی نوحہ کناں، آنکھ سے آبگینے تھے پھوٹے ہوئے
چند ہاتھوں میں گلشن کی تصویر تھی، چند ہاتھوں میں آئینے ٹوٹے ہوئے
سب کے دل چور تھے، سب ہی مجبور تھے، بیکسی وہ کہ تابِ نظارا نہیں

شہرِ ماتم تھا اقبالؒ کا مقبرہ، تھے عدم کے مسافر بھی آئے ہوئے
خوں میں لت پت کھڑے تھے لیاقت علی، روحِ قائد بھی تھی سر جھکائے ہوئے
کہہ رہے تھے سبھی کیا غضب ہو گیا، یہ تصور تو ہرگز ہمارا نہیں

سرنگوں قبر پر تھا منارِ وطن، کہہ رہا تھا کہ اے تاجدارِ وطن،
آج کے نوجواں کو بھلا کیا خبر، کیسے قائم ہوا یہ حصارِ وطن،
جس کی خاطر کٹے قوم کے مرد و زن، ان کی تصویر ہے یہ منارا نہیں

کچھ اسیرانِ گلشن تھے حاضر وہاں، کچھ سیاسی مہاشے بھی موجود تھے
چاند تارے کے پرچم میں لپٹے ہوئے، چاند تاروں کے لاشے بھی موجود تھے
میرا ہنسنا تو پہلے ہی اک جرم تھا، میرا رونا بھی ان کو گوارا نہیں

کیا فسانہ کہوں ماضی و حال کا، شیر تھا ایک میں ارضِ بنگال کا
شرق سے غرب تک میری پرواز تھی، ایک شاہین تھا میں ذہنِ اقبال کا
ایک بازو پہ اُڑتا ہوں میں آج کل، دوسرا دشمنوں کو گوارا نہیں

یوں تو ہونے کو گھر ہے سلامت رہے، کھینچ دی گھر میں دیوار اغیار نے
ایک تھے جو کبھی آج دو ہو گئے، ٹکڑے کر ڈالا دشمن کی تلوار نے
گھر بھی دو ہو گئے در بھی دو ہو گئے جیسے کوئی بھی رشتہ ہمارا نہیں

کچھ تمہاری نزاکت کی مجبوریاں، کچھ ہماری شرافت کی مجبوریاں
تم نے روکے محبت کے خود راستے، اس طرح ہم میں ہوتی گئیں دوریاں
کھول تو دوں میں رازِ محبت مگر تیری رسوائیاں بھی گوارا نہیں

اس چمن کے بھی بلبل ستائے ہوئے اُس چمن کے بھی بلبل ستائے ہوئے
آج شاخ و شجر، لیے صحن و چمن، باغبانوں سے ہیں خوف کھائے ہوئے
وہ نہ زندوں میں ہیں اور نہ مُردوں میں ہیں، ایسی موجیں ہیں جن کا کنارا نہیں

وہ جو تصویر مجھ کو دکھائی گئی، میرے خونِ جگر سے بنائی گئی،
قوم کی ماؤں بہنوں کی جو آبرو، نقشۂ ایشیا میں سجائی گئی،
موڑ دو آبرو، یا وہ تصویر دو، ہم کو حصوں میں بٹنا گوارا نہیں

(شاعر مشیر کاظمی)

سوال: ۱، میں نے ہر شخص کو اطمینانِ قلب کی تلاش میں دیکھا، کیا یہ کوئی ایسی ہی اہم چیز ہے جس کے بغیر سکون نہیں ملتا؟

جواب: تمام مخلوقات میں سے انسان کے دماغ میں ہی یہ صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، کہ وہ معاملات کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے، حالات و واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی، سچ اور جھوٹ حق اور باطل، نفع اور نقصان میں تمیز کرتا ہے، اس طرح ہر معاملہ میں اسے "اطمینان قلب" کی ضرورت ہوتی ہے، اطمینانِ قلب کے بعد ہی وہ اپنی تمامتر صلاحیتیں کسی کام میں صرف کرتا ہے، خدا کے پیغمبروں تک نے بھی بعض معاملات میں اپنے خدا سے 'اطمینانِ قلب' کی درخواستیں کی ہیں، جن کو قبول بھی کیا گیا ہے۔

اطمینانِ قلب کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی دماغی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ تفکرات اور پریشانیاں، رنج وغم اور خوف انسان کے دماغ کو صحیح طور پر کام نہیں کرنے دیتے، دماغ ہمیشہ اسی حالت میں صحیح کام کرتا ہے، جب تفکرات سے پاک ہو، جب یہ ٹھنڈا ہو گرم نہ ہو۔ دماغ کی تیزی کی حالت میں اُس کے فیصلوں کو اس کی خواہشات یا جذبات کنٹرول کرتے ہیں جن کے نتائج بعض اوقات بڑے ہی بھیانک ہوتے ہیں ۔ دماغی قوت بذاتِ خود تحمل اور بردباری سے پرورش پاتی ہے اور اطمینانِ قلب اس کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

دیکھئے باب اوّل، اطمینانِ قلب کی ضرورت واہمیت اور اطمینانِ قلب قوت وطاقت کا سرچشمہ

سوال: ۲- ڈاکٹر اور اطباء صحت کے اصولوں پر زور دیتے ہیں، ماہرین نفسیات ذہنی کیفیات سے بحث کرتے ہیں، علماء اور پیشوا عبادات اور روحانی ترقی پر زور دیتے ہیں، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرتِ انسان کی شخصیت آخر کن چیزوں کا مجموعہ ہے اور ان میں توازن کی کیا صورتیں ہیں۔؟

جواب: انسانی جسم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ انسان کی شخصیت بنیادی طور پر تین اجزا سے مرکب ہے۔ ایک جسم۔ دوسرا نفس تیسری روح، قدرت نے ان تینوں چیزوں کو انسانی جسم کے اندر ایسے بہترین انداز میں سمو دیا ہے کہ کسی لمحہ ان تینوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور انسان بیک وقت ان تینوں چیزوں کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے، جب بھی وہ کسی ایک چیز کی طرف زیادہ جھکاؤ اختیار کرے گا، اس کی شخصیت کا توازن بگڑ جائے گا۔ اس لئے انسان ان تینوں اجزاء کی حقیقت اور ضروریات کو اچھی طرح سمجھ کر اور ہر ایک کے تقاضے پورے کر کے ہی اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ انسان کی رُوح ایک چراغ ہے، انسان کا دل شیشے کی وہ قندیل ہے جس کے اندر یہ چراغ روشن ہے اور انسان کا جسم وہ طاقچہ ہے، جس کے اندر یہ قندیل لٹک رہی ہے۔

دیکھئے باب چہارم۔ انسان کے اجزاءئے ترکیبی اور ان کی ضروریات۔

سوال: ۳- میں بعض اوقات ناموافق حالات سے مایوس ہو کر اپنی زندگی کو ختم کر دینے پر تُل جاتا ہوں، بعض اوقات غضب ناک ہو کر اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی جانیں لے ڈالنا چاہتا

ہوں اور بعض اوقات اپنے اندر ایسی صلاحیتیں محسوس
کرتا ہوں، جن کی مدد سے زمین و آسمان کی ہر چیز کو اپنے لئے
مسخر پاتا ہوں اور چاند پر کمندیں ڈالنے لگتا ہوں ۔ کیا آپ
مجھے بتائیں گے کہ اس کائنات میں دراصل میری حیثیت کیا ہے؟
یہ کائنات کیسی ہے اور اس میں میرا مقام کیا ہے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں آج انسانوں کی ایک کثیر تعداد
ایسی ہے، جس نے کبھی انسانی زندگی کے فطری سوالات کے متعلق سوچنے اور
غور و فکر کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ہے، حالانکہ انسانی فطرت پکار پکار
کر انسان کو ان مسائل کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے اور اس کائنات کے ٹھوس
حقائق قدم قدم پر اُسے ٹھوکریں دگا کر اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش
کرتے رہتے ہیں ۔ مگر انسان ہے کہ بلا سوچے سمجھے عقل اور فکر کی صلاحیتوں
سے کام لئے بغیر زندگی کے دن پورے کئے جا رہا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اگر
اُسے کسی چیز کی فکر ہے تو وہ محض زندگی کے حیوانی تقاضوں کے پورا
کرنے کی، اس کی ساری دوڑ دھوپ اور سعی و جُہد بس اپنی حیوانی ضروریات
تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔ اس نے انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ
اور ارفع مقام کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں ہے، اس غفلت، لاپرواہی، اور
لاابالے پن کی وجہ سے اس کی زندگی اپنے اصل محور و مرکز سے بہت دُور
چلی گئی ہے، جس کی وجہ سے اس کے ذہن میں ہر دم بے اطمینانی کا ایک
لاوا پک رہا ہے، جس کو ٹھنڈا کرنے کی اُسے کوئی سبیل نظر نہیں آتی ہے۔

دیکھئے باب پنجم و ششم ۔ کائنات کی حقیقت، انسانی زندگی کے فطری سوالات

سوال ۴: میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں موت ایک اٹل حقیقت ہے، کوئی چاہے یا نہ چاہے اسے دیر یا سویر بہر حال مرنا ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد، کیا ہم ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے؟ یا ہمیں دوبارہ زندگی ملے گی؟ جدید سائنسی ایجادات ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اس فضا میں ہر انسان کی آوازیں، حرکات و سکنات اعمال و افعال محفوظ کئے جا رہے ہیں اور اُن کی فلم تیار کی کی جا رہی ہے، اگر مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ زندگی ہی نہ ملی تو اس سارے اہتمام کا ماحصل کیا ہوگا؟۔ اسی قسم کے دیگر سوالات و وجوہات کی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی اور اپنی موت کے مسئلہ کو سمجھ سکوں، کیا آپ اس معاملہ میں میری راہنمائی کریں گے؟

جواب: امریکہ کے مشہور ماہر عمرانیات و نفسیات ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل کی کتاب (Stay Alive All Your life) (STAY کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یورپ کے لوگ بھی اپنے مفکرین سے یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ:

I wish I would believ͏e in a life after, but I can't is there any proff of Immartality Beyond what religion teacher ?

جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ:

One of the most significant facts about modern thinking is the new conviction that the universe is spiritual. The old materialistic conception is fading Carrent scientific Investi- gation seems to lend support to our Institutions and faith.

Recently an eminent scientist expressed his personal belief that the soul theary has been according to the minimum standards of science.

ترجمہ سوال: میں چاہتا ہوں کہ میں "زندگی بعد الموت" پر ایمان لے آؤں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر پاتا۔ کیا مذہب کے علاوہ بھی کوئی ایسی ثبوت ہے جس سے زندگی کا تسلسل ثابت ہو۔؟

ترجمہ جواب: جدید سوچ کے اہم ترین حقائق میں سے ایک اعتقاد یہ بھی ہے کہ کائنات کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ کائنات سے متعلق مادیت پر مبنی پرانا نکتہ نظر اپنی معنویت کھوتا چلا جارہا ہے۔ موجودہ سائنسی تحقیق ہمارے عقائد اور فکری اداروں کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔ حال ہی میں ایک ممتاز سائنسدان نے اپنے ذاتی عقیدہ کے طور پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ روح کا نظریہ سائنس کے کم از کم معیار کے مطابق ثابت ہوگیا ہے۔

جدید سائنسی ایجادات اور نظریات نے بھی آج واقعی ہمارے سامنے ایسے حیرت انگیز انکشافات کر دیتے ہیں، جن سے ہمارے مذہبی عقائد و نظریات کی تائید ہوتی ہے، مگر آسمانی کتابوں نے تو ابتدائے آفرینش سے ہی ہمیں اپنی زندگی کی مختلف منازل سے آگاہ کر دیا تھا اور خصوصاً مرنے کے بعد کی زندگی اور دوبارہ جی اُٹھنے کے مسئلہ کو نہایت واضح اور دو ٹوک انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا تھا، کیونکہ اس مسئلہ کا ہماری موجودہ زندگی کے بگڑنے اور سنورنے کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ تمام آسمانی کتابوں اور صحائف کی تعلیمات کا احاطہ کرنے والی آخری جامع کتاب "قرآنِ پاک ہمیں بتاتی ہے کہ :

دُنیا کے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی حضرت حوّا علیہا السلام کو کچھ عرصہ کے لئے جنّت میں رکھا گیا تاکہ انہیں دنیوی زندگی کے متعلق ضروری ہدایات (Directives) دے دی جائیں اور یہ جنّت ہی دراصل انسان کا وطن اصلی تھا اور ہے۔

اس ابتدائی تربیت گاہ میں انہیں پہلی بات تو یہ سمجھائی گئی کہ دنیا کی زندگی میں انہیں اپنے ازلی دشمن شیطان اور اس کے ساتھیوں سے ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ اس کی مستقل کوشش یہ ہوگی کہ وہ انسان کو سفلی جذبات و خواہشات کے ذریعہ رضائے الٰہی کے راستہ سے ہٹا دے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی کہ مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے انسان کا اصلی گھر جنّت ہے۔ اور ایک عارضی مدّت کے لئے اُسے دنیا میں آزمائشی خلافت عطا کی جا رہی ہے۔ اور یہ دُنیا اس کا عارضی وطن ہے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی کہ انسان اپنے اس اصلی مقام اور فردوسِ گم گشتہ

کو صرف اسی صورت حاصل کر سکے گا جب کہ وہ شیطانی ترغیبات سے ہوشیار رہ کر رضائے الٰہی کے راستہ پر ثابت قدم رہے گا۔

چوتھی بات یہ بتائی گئی کہ انسان دنیا میں شیطانی ترغیبات کا مقابلہ صرف اسی صورت کر سکے گا جب کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی بتائی ہوئی سچی باتوں (عقائد و نظریات) کو اپنے دل سے مانے گا اور اُن کے لائے ہوئے دین کو عملی طور پر اختیار کرے گا۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی کہ دنیوی زندگی کے دوران ہر انسان کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ کیا جا رہا ہے اور جن لوگوں کا نیکی کا پلڑا بھاری پایا گیا وہی لوگ یوم حساب میں کامیاب ہوں گے اور انہیں ہی جنّت کی زندگی عطا کی جائے گی اور برائیاں سمیٹنے والوں کو جہنّم کا عذاب دیا جائے گا۔

گویا

انسان کی زندگی کا یہ عمل ایک مسلسل عمل ہے جس کے مختلف مراحل بتائے گئے ہیں۔

پہلے مرحلہ پر صرف روحوں کی تخلیق کی گئی جن سے اپنے خالق اور رب کی اطاعت کا عہد لیا گیا۔

دوسرے مرحلہ، پر روحوں کو مادی اجسام کے قالب عطا کئے گئے۔ اس مرحلہ میں انسانی اجسام کو نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی اور روحیں پس منظر میں چلی گئیں اور اجسام پر خواہشات و جذبات حکمرانی کرنے لگے۔

تیسرے مرحلہ پر جب پھر روح کو جسم سے الگ کر لیا گیا تو انسان پر موت وارد ہو گئی اور جسم پس منظر میں چلے گئے اور روح کو فوقیت حاصل ہو گئی، اور

احساسات اور واردات کا مرکز پھر روح بن گئی۔

چوتھے مرحلہ پر جب جسموں کو دوبارہ زندہ کر کے ان میں روحیں داخل کی جائیں گی۔ تو اُن کو پھر سے ایک نئی زندگی مل جائے گی اور جن لوگوں نے دنیا کی زندگی اللہ کی فرمانبرداری اور اطاعت میں گذاری اُن کو جنّت کی ابدی زندگی کا انعام دے دیا جائیگا۔

(قرآنِ مجید میں آدمؑ کی پیدائش اور نوعِ انسانی کی ابتدا اور ابلیس وغیرہ کا یہ قصّہ سات مقامات پر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

سورۃ البقرہ آیت ۳۰ تا ۳۹۔ سورہ الاعراف رکوع ۲۔ سورہ الحجر رکوع ۳ بنی اسرائیل رکوع ۷، الکہف رکوع ۷۔ طٰہٰ رکوع ۷۔ ص رکوع ۵)

مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے باب ہشتم۔ ایمان بالآخرت صفحہ ۲۱۶ آخرت پر ایمان اور اطمینانِ قلب

سوال: ۵۔ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب عقائد کی درستی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ کیا عقیدہ میں کوئی ایسی قوت پائی جاتی ہے جو انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

جواب:۔ انسان کو عمل پر ابھارنے والے عوامل دراصل اُس کے وہ نظریات و خیالات ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں راسخ ہوتے ہیں۔ جنہیں مذہب کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ اس لئے ہر مذہب اوّل نمبر پر ایمانیات کی درستی پر ہی زور دیتا ہے۔

یقین و اعتماد ایک کامیاب زندگی کا بنیادی راز ہے، تم اپنی زندگی کو اپنی خواہش کے مطابق کامیاب بنا سکتے ہو۔ بشرطیکہ تمہیں خدا پر اور اپنی ذات پر کامل اعتماد پیدا ہو جائے۔ تمہیں اپنے پسندیدہ مقاصد حاصل کرنے

میں اُسی وقت کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔ جب تم کچھ تعمیری اور مثبت عقائد و نظریات کو اپنا لو۔ جس کے لئے پہلے نمبر پر یہ ضروری ہے کہ تم اپنے خدا پر شعوری ایمان لانے والے بن جاؤ، محض زبانی طور پر نہیں، دوسرے نمبر پر یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اس دنیا میں تم کوئی معمولی چیز نہیں ہو بلکہ تمہاری حیثیت نائب خدا یعنی خدا کے خلیفہ (Viceroy) کی ہے۔ تم اپنی زندگی کی قدر و قیمت کو پہچانو۔

تم اپنے عقیدہ پر یقین کو کیسے پختہ و راسخ کر سکتے ہو، ابتدا میں ایک عقیدہ والے انسان کی حیثیت سے جینا شروع کرو۔ ایمانیات میں شک اور تذبذب کی کیفیت ختم کرو اور منفی طور پر سوچنا بند کرو، ابتدا میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ اپنے خدا کی عبادت کرو، اپنی خیر و بھلائی اور اپنی بہتری کی اُمید رکھنے کی عادت ڈالنا سیکھو۔ آپ کی سوچ کا یہ طریقہ آپ کی زندگی کے بہاؤ میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پیدا کرے گا، کیوں کہ انسانی زندگی نے تو بہر حال ایک بہاؤ اختیار کرنا ہوتا ہے، غلط رُخ پر یا صحیح رُخ پر کسی ایک راستہ پر یا کسی دوسرے راستہ پر، اس لئے اپنی زندگی کی باگیں تھام کر اپنے عقائد و نظریات کے حوالہ کرو، اس طرح تم دیکھو گے کہ مایوسی، بے یقینی اور لاپرواہی پیدا کرنے والے عوامل تمہارے ذہن سے زائل ہونا شروع ہو جائیں گے اور کامیابی کے عوامل ایک مقناطیسی کشش کے ساتھ آپ کی طرف کھنچتے چلے آئیں گے۔

خدا پر اعتماد و یقین پیدا کرنے کی یہ مشق ہمیشہ جاری رکھو اور یہ مشق کرنے کا جو طریقہ خدا کے سچے پیغمبروں نے اور خود خدا نے اپنی آخری کتاب

میں بتایا ہے اس پر عمل کرتے رہو تو تمہیں یقیناً کامیاب و خوشحال زندگی نصیب ہوگی، اگر وقتی طور پر تمہیں کچھ مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوا تو تم نہایت آسانی کے ساتھ اپنے صبر اور اپنی عبادت کے ذریعہ اُن سے عہدہ برآ ہو سکو گے۔

بے شک اُن لوگوں کے لئے جو خدا پر اعتماد اور اس کے قوانین پر عمل کرتے ہیں اس کی عنایات کی کوئی حد نہیں ہوتی، مگر اپنی کامیابی کا یہ مطلب بھی ہرگز نہ سمجھو کہ تم لازماً ایک دولت مند، مشہور یا ایک مقتدر آدمی بن جاؤ گے اور تمہاری تمام ضروریات پوری ہو جائیں گی، کیونکہ اس کائنات کا نظام کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی مشیّت کے مطابق چل رہا ہے۔ تم صرف وہی چیز حاصل کر سکو گے جو اللہ کی مشیّت میں تمہارے لئے بہتر ہوگی اس لئے بے صبری اور اضطراب سے بچنا ہوگا۔ اور یہ ساری کیفیات تمہارے اندر تمہارا ایمان پیدا کرے گا۔

تفصیل کے لئے دیکھئے۔ باب ہشتم اطمینان قلب کی راہیں۔ ایمان کا مطلب ایمان کے فوائد۔

سوال : ۶ ا۔ یہ کیا چیز ہے جو مجھے اکثر اوقات رنجیدہ و ملول رکھتی ہے اور اس کے متعلق میں کیا کر سکتا ہوں...؟

ب۔ میں اپنی زندگی یا اپنے خدا ہی پر کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں اور اعتماد قائم رکھ سکتا ہوں جب کہ میں آلام و مصائب کے بوجھ کے نیچے پس رہا ہوں...؟

ج۔ میں اپنی زندگی میں چھوٹے چھوٹے کاموں کو ہاتھ میں کے

کر اُن کو سر انجام دے سکتا ہوں، مگر میں بڑے بڑے کاموں پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتا ہوں، کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟

د۔ مجھے ہمیشہ اپنی قوّت پر شبہ رہتا ہے کہ میں اپنی زندگی میں حسبِ خواہش کام نہ کر سکوں گا، میں اپنے آپ پر اس بے اعتمادی کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں؟

ڈ۔ میں اُن چیزوں کے متعلق تفکرات اور پریشانیوں سے اپنے آپ کو کیسے روک سکتا ہوں، جن کے متعلق کچھ کر گذرنا میرے امکان میں نہیں ہے...؟

ڈ۔ میں اپنے مسائل سے کیسے سمجھوتہ کر سکتا ہوں، جب کہ میں اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے تنہا محسوس کرتا ہوں۔ ایسا تنہا کہ اُن کو حل کرنے کے لئے خود اعتمادی ہی کھو بیٹھتا ہوں۔

جواب: ۱۔ رنج و ملال یعنی حزن کی کیفیت انسان کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے گزشتہ زمانہ کے نقصانات کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ یہ رنج و ملال انسان کو ماضی کے واقعات اور دبے ہوئے خیالات کے دوبارہ اُبھر آنے سے پریشان کرتا ہے جن سے انسان نے زخم کھا رکھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان گذشتہ زمانہ کے نقصانات کے متعلق سوچتے رہنے سے ان کا کچھ بھی ازالہ نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے ذہن کو مستقلاً تفکرات اور پریشانیوں کے حوالہ کر دے، جس سے اس کا ذہن کسی نئے بحران میں مبتلا ہو جائے۔ اس لئے اس کا سیدھا سادا علاج یہ ہے کہ اُن کو بھول جائے اور اُن کو اپنے خدا کی مشیّت قرار دے کر اُن کی تلافی کے لئے

خدا سے بھلائی اور صبر کی دُعا مانگے۔ کیوں کہ ہر مسلمان اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اُسے اس وقت تک نہ کوئی نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان دے سکتی ہے۔ جب تک خدا کو منظور نہ ہو اور اس سے اس وقت تک کوئی چیز نہ چھن سکتی ہے نہ حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک اس کا خدا ایسا نہ چاہے۔ اس عقیدہ کی یادداشت ہی اسے رنج والم سے آزاد کر سکتی ہے۔

ب۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آلام ومصائب کا مقابلہ کرنے اور انہیں برداشت کرنے کے عزم میں آپ نے ذرا بھی کمزوری دکھائی تو وہ آپ کو دبوچ لیں گی اور اگر آپ اپنے ذہن کو ذرا سا چابک لگا کر ان کا مقابلہ کرنے کے عزم کو تازہ کریں گے اور اپنے طاقتور خدا پر اعتماد و بھروسہ کریں گے تو وہ اُن مصائب سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دیں گے۔ ہمارے پاکیزہ عقائد اور خدا کی صفات کا شعور ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ مصائب و پریشانیوں کی حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر اُن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح غلط اور کمزور عقائد ہمیں پریشانیوں میں مبتلا کرنے کا سبب بنتے ہیں اس طرح صحیح اور مضبوط عقائد اُن سے چھٹکارا پانے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ج۔ جس اعتماد اور یقین کے ساتھ آپ چھوٹے چھوٹے کاموں کو ہاتھ میں لے کر سر انجام دے لیتے ہیں، اسی اعتماد اور یقین کے ساتھ آپ کسی بڑے کام کا بھی منصوبہ بنا سکتے ہیں مگر یہ خیال رکھیں کہ وہ کام اتنا بڑا بھی نہ ہو جس کے آپ وسائل بھی نہ فراہم کر سکیں اور وہ کام ادھورا رہ جائے اور آپ پریشان ہو جائیں۔ کسی بڑے کام کا منصوبہ بنانے سے یقیناً آپ

کے عزم اور حوصلہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ کیوں کہ آپ کا خدا چاہتا ہے کہ آپ سوچیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ آپ کا یہ اعتماد و یقین آپ کے لئے بڑے نتائج پیدا کرے گا۔ بڑے بڑے کام سرانجام دینے کا فارمولا یہ ہے۔

بڑے منصوبے + بڑے خیالات + پختہ یقین + بڑی محنت

اسی فارمولا کے ذریعہ آپ بڑی بڑی مشکلات پر بھی قابو پا سکیں گے۔ بس صرف کمر ہمت باندھنے کی ضرورت ہے۔

د۔ اس حقیقت کو بھی آپ سمجھ لیں کہ ہر فرد اپنے متعلق خود ہی ایک اندازہ مقرر کرتا ہے اور اس کا یہ بنیادی اندازہ ہی طے کر دیتا ہے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے تم اپنے متعلق جس تخمینہ پر یقین رکھو گے اس سے زیادہ کچھ نہیں بن سکو گے آپکا بلند عزم اور حوصلہ ہی آپ کے یقین و اعتماد میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اور یہ یقین و اعتماد ہی آپ کی آگے بڑھنے کی قوت کے لئے مہمیز ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے کمزوری اور سستی کو ترک کر کے حوصلہ و عزم کو بلند کیجئے۔

ر۔ تفکرات اور پریشانیوں پر غالب آنے کا واحد ذریعہ تمہارا وہ عقیدہ ہے جو تمہارے ذہنی نقطۂ نظر کو درست کر دے ، دو بڑی قوتیں اس دنیا میں دوسری تمام قوتوں پر غالب ہیں۔ ایک خوف اور دوسرا عقیدہ اور عقیدہ خوف سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ کیوں کہ یہ خوف کو بھی دُور کر دیتا ہے۔ اور انسان کو بڑے بڑے پُرخطر حالات میں سینہ تان کر کھڑا ہونے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔

ڑ۔ قرآن پاک اور دوسری آسمانی کتابوں میں ایسے ایسے ارشادات ہیں جو انسان کی زندگی کو بدل ڈالتے ہیں۔

مثلاً اگر ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہو تو کون ہمارا دشمن ہو سکتا ہے۔

"میری رحمت سے مایوس تو وہ ہوتے ہیں جو مجھ پر ایمان نہیں لاتے یعنی یقین و اعتقاد نہیں کرتے؛ (اِنَّهٗ لَا يَا۟يْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورہ یوسف)

"اگر دنیا کے اسباب اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اُن پر بھروسہ چھوڑ کر میرا دامن تھام لے تو پھر خوف اور غم اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے جو اس کے سکون و اطمینان کو تلپٹ کر دیتے ہیں۔" (سورہ حٰم سجدہ آیت ۳۰)

"خدا کی قدرت ہر چیز پر غالب ہے، جو بڑی طاقتوں اور دبدبے کا مالک ہے۔ جس کے اِذن اور اجازت کے بغیر دنیا کی کوئی چیز اُسے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، زمین و آسمان کی ساری چیزیں طوعاً وکرھاً اُس کے آگے جھکی ہوئی ہیں، زمین و آسمان کے سارے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں ہیں، تمام انسانوں کی پیشانیوں کے بال اُسی کی مٹھی میں ہیں، وہی بہترین مددگار اور کارساز ہے۔ پس ایمان والوں کو چاہیئے کہ اُسی پر توکل کریں۔

رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ عزت اور دولت بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے عزت دے دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔"

خدا کی ان باتوں کو اپنے اوپر اس طرح وارد کرو تا کہ وہ براہِ راست آپ کی ذات پر منطبق ہو سکیں ... اور اب اپنے ذہن میں اس خدا کی تصویر حاضر کرو، جو تمہاری مشکلات کا خود سامنا کر رہا ہے، کیا تمہاری مشکلات خدا کے مقابلہ میں بھی ٹھہر سکتی ہیں۔ اس طرح جب خدا پر کامل اعتماد

بھروسہ رکھتے ہوئے اُس کی مدد حاصل کرنے کے لئے دُعا کریں گے تو تمہارے اندر ایک توانائی اور برقی قوت ابھر آئے گی۔

پھر آپ یہ یاد رکھیں کہ مسلسل قوت حاصل کرنے کا سرچشمہ خدا کی مرضی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینا اور اُس کی رضا پر راضی رہنا ہے۔ اپنے خیالات اور اپنی زندگی کو خدا کے ٹھوس اور غیر عاجلانہ پروگراموں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں، اکتا دینے والے اور تھکا دینے والے خیالات کا تدارک آپ خدا کی مشیئت پہ راضی رہنے سے ہی کر سکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں بار بار تازہ کرنے، انہیں یاد رکھنے اور ان کی مشق کرنے کا بہترین ذریعہ۔ نماز۔ ہے۔ جو آپ کو ایک دن میں پانچ وقت دنیوی جھنجھٹوں سے علیحدہ کر کے یکسوئی کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے حاضر کر کے اُسے ہمکلام ہونے کا موقع فراہم کر دیتی ہے۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ اگر آپ نماز کو بلا سوچے سمجھے محض رسمی طور پر نہ ادا کر رہے ہوں بلکہ حاضر دماغی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوں تو کس طرح قرآن پاک کے مختلف ارشادات ہر وقت آپ کی راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے باب ہفتم،

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

علامہ اقبالؒ

سوال : ۷ و۔ مجھے اکثر کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کئی معاملات میں غلطی پر ہوں۔ میں ان غلطیوں سے کیسے بچ سکتا ہوں

ب۔ میں اپنی ذہنی کیفیت کا تابع (MOODY) انسان ہوں، میں اپنی زندگی کے متعلق مثبت اور خوشگوار نقطۂ نظر کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

ج۔ میں اپنی زندگی کے بور پن پر کس طرح قابو پا سکتا ہوں اور اپنے روزمرہ کاموں میں نیم جان احساسات کو کیسے ختم کر سکتا ہوں؟

د۔ میں اپنی زندگی کے متعلق بے یقینی کی کیفیت کو کیونکر ختم کر سکتا ہوں؟

جواب :۔ آپ کے یہ سوالات اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ آپ نے اپنی زندگی کی قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، آپ کو یہ جاننا چاہیئے کہ اس کائنات کی سب مخلوق پر آپ کو ہر لحاظ سے بزرگی اور شرف حاصل ہے۔ اور آپ کے خالق نے کائنات کی ہر چیز کو آپ کے لئے سازگار اور مسخر کر دیا ہے، اس لئے آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک قیمت رکھتا ہے۔ آپ کو اس کائنات میں خدا کی نیابت کا حق ادا کرنا ہے۔ اس لئے آپ اس منصب کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں،

دوسری چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے ابھی تک اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین نہیں کیا ہے، حالانکہ آپ کے منصب خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ آپ کی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور دوڑ دھوپ کا

محور خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔ کیونکہ آپ کو پیدا بھی خدا نے کیا ہے، آپ کو زندگی دینے والا بھی وہی ہے۔ آپ کا پروردگار اور رزق دینے والا بھی وہی ہے۔ اور آپ سے اس زندگی کا حساب کتاب لینے والا بھی وہی ہے۔ اس لئے آپ کو اپنے منصبِ خلافت کو ذہن میں رکھ کر خدا کی رضا حاصل کرنے کے نصب العین کے لئے ہر وقت سرگرمِ عمل رہنا چاہیئے۔ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو منفی خیالات، زندگی کے بودے پن، نیم جان احساسات اور بے یقینی جیسی کیفیات سے نجات مل جائے گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ تفکرات اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے باب ہفتم، نصب العین کا فقدان

سوال : ۸ ، وہ کون سے عوامل ہیں جو انسان کے لئے اطمینانِ قلب سے محرومی کا باعث بنتے ہیں اور ان کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟

جواب :- میرے نزدیک انسان کو اطمینانِ قلب سے محروم کر دینے والے عوامل دس ہیں۔

۱۔ زندگی کے نصب العین کا فقدان

۲۔ غلط توقعات

۳۔ طولِ امل

۴۔ مال وجاہ کی لامتناہی حرص

۵۔ معیارِ زندگی کی بلندی کا چکر

۶۔ تقسیمِ رزق کی حکمت سے بے خبری

۷۔ جذباتیت

۸۔ خدا فراموشی اور ذکرِ الٰہی سے غفلت

۹۔ زندگی کا غلط لائحہ عمل

۱۰۔ مجرمانہ ذہنیت اور عاداتِ بد۔

مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے باب ہفتم.... بے اطمینان کے اسباب
باب دوازدہم ، اطمینانِ قلب کے لئے ضروری شرائط

سوال : ۹- آپ کی تشریح کے مطابق انسان جب تین عناصر، جسم نفس اور روح کا مجموعہ ہے تو کیا آپ کسی ایسے مذہب کی نشاندہی کر سکتے ہیں ، جو ان تینوں کی ضروریات کا بیک وقت لحاظ رکھتا ہو۔

جواب : اللہ تعالیٰ نے اوّلین پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الزمان پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم تک جتنے پیغمبر بھی دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے وہ سب اصولی طور پر ایک صحیح دین لے کر آئے تھے۔ مگر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اُن مذاہب کے اصول اور تفصیلات محفوظ نہ رہ سکیں ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخر الزمان پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایک کامل دین اور صحیح نظامِ زندگی اتارا جو قیامت تک کے لئے کافی ہوگا۔ اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی حفاظت کا بھی بہترین انتظام فرمادیا، یہ مذہب اور دین ، دینِ اسلام ہے جو بیک وقت ہمارے جسم ، ہمارے نفس ، ہماری روح تینوں کے تقاضے نہایت بہترین طریقہ سے پورے کر رہا ہے اور اس

نے اپنی عبادات، اخلاق، دیوانی اور فوجداری قوانین میں ان کو اس طرح سمو دیا ہے کہ جتنا جتنا ہم غور کرتے ہیں ہمیں اطمینان حاصل ہوتا ہے

سوال: ۱۰۔ کیا آپ ایک مطمئن انسان کی زندگی کا خاکہ ہمارے سامنے پیش کریں گے، جس کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اپنی زندگیوں کے لئے راہنمائی حاصل کر سکیں؟

جواب: یقیناً میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ سوال بالکل بجا ہے اس لئے ایک مطمئن انسان کی زندگی کا خاکہ پیش کرنے کی بھی میں نے کوشش کی ہے۔

سوال: ۱۱۔ قرآنِ پاک میں کئی مقامات پر یہ فرمایا گیا ہے۔ "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" خبردار رہو کہ اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا آپ اس کی تشریح بھی کریں گے؟

جواب:۔ اطمینانِ قلب کے حصول کے معاملہ میں قرآنِ پاک کی اس آیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس آیت میں ذکرِ الٰہی سے مراد مفسرین نے خدا کے ذاتی نام "اللہ" اور اس کے تمام صفاتی ناموں کے ذکر کی بھی لی ہے اور کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ اور اسی طرح کے دیگر کلمات کو بھی لیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مفسرین نے یہاں پر ذِکر کے معنی قرآنِ پاک کے بھی کئے ہیں، جس کی ساری تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی انسان کو حقیقی اطمینانِ قلب مل سکتا ہے۔

۵

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اسمائے گرامی مُصنّفین و کُتب

جن سے بصد شکریہ اس کتاب کی ترتیب میں استفادہ کیا گیا

نمبر شمار	نام کتاب	نام مُصنّف
۱-۲	"زادالمعاد" "مدارج السالکین"	علامہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ
۳-	"فتوح الغیب"	الشیخ سید عبدالقادر جیلانی رح
۴-	"کشف المحجوب"	سید ابوالحسن علی ہجویری رح المعروف داتا گنج بخش
۵-	"تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اوّل، دوم)	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۶-	"انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ
۷-۸	"تفہیم القرآن" "دعوتِ اسلامی اور اسکا طریق کار"	منفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ
۹-۱۰	"اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر"	
۱۱-۱۲	تذکرۃ انبیاء" "تنقیحات" "اسلام کا بنیادی عقیدہ	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۱۴-۱۳	"اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر"، "تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔	"
۱۵-	" اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی	"
۱۶-	" فضائلِ ذکر"	شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریاؒ سہارنپوری
۱۷-	ذِکراللہ"	مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب کراچی
۱۸-	اسلام اور تعمیرِ شخصیت"	میاں عبدالرشید صاحب ایم اے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور
۱۹-	"مغربی تہذیب کا بحران"	جناب ریاض الحسن نوری ایم اے
۲۰-	ایمان وسعادت کا باہمی تعلق	جناب پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم گوجرانوالہ
۲۱-	STAY ALIVE ALL YOUR LIFE	پروفیسر ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل امریکہ
۲۲-	" پریشان ہونا چھوڑیئے"	ماہرِ نفسیات ڈیل کارنیگی
۲۳-	" میٹھے بول کا جادو"	
۲۴-	" کامیابی کے راز وغیرہ	
۲۵-	سو سال تک زندہ رہیئے"	" لیوجی کا رینرو"
۲۶-	" خدا موجود ہے"	" جان کلوور مونزما" (ترجمہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۲۷۔	"نہج البلاغۃ"	ارشادات حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۲۸۔	سیرت النبیؐ رحمۃ للعالمین	علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ
۲۹۔	سیرت النبیؐ	علامہ سید سلیمان ندویؒ
۳۰۔	انسانیت کا امتیاز	مولانا قاری محمد طیب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند (انڈیا)
۳۱۔	قصص القرآن	
۳۲۔	تفاسیر قرآن	متعدد
۳۳۔	کتب احادیث	متعدد

نو باتیں

حضورؐ نے فرمایا:- "میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے

۱۔۔۔۔ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈردں۔

۲۔۔۔۔ کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصہ میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں

۳۔۔۔۔ چاہے امیر ہوں یا فقیر، راستی و اعتدال پر قائم رہوں

۴۔۔۔۔ جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں

۵۔۔۔۔ جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں

۶۔۔۔۔ جو مجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کروں

۷۔۔۔۔ میری خاموشی، غور و فکر کی خاموشی ہو

۸۔۔۔۔ میری نگاہ، عبرت کی نگاہ ہو

۹۔۔۔۔ میری گفتگو، ذکر الٰہی کی گفتگو ہو اور نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔